دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۹ ماہ صفر المظفر ۱۴۳۳ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۱۲ء عدد ۱

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اللہ رب العزت کی بارگاہ عالی میں ہم سراپا سپاس ہیں کہ معارف کے اس شمارے سے اس کی ۱۸۹ویں جلد کا آغاز ہوتا ہے، قریب ۹۶ سال سے اوقات اور کسی نہ کسی حد تک معیار کی پابندی کے ساتھ معارف کی یہ دیرینہ اور مسلسل خدمت صرف توفیق الٰہی ہے، اس پر جتنا شکر کیا جائے کم ہے، ہماری دعا ہے کہ اسی طرح تا دیر اس کو ادائے خدمت کا موقع ملتا رہے، قارئین سے بھی آمین کی درخواست ہے۔

یہ شمارہ ایسے ماحول میں نکل رہا ہے جب ملک کی پانچ ریاستوں میں اسمبلی کے انتخابات کا غل ہے، خصوصاً یوپی کے انتخابات زیادہ اہم ہیں اس لیے قدرتاً اور ریاستوں کی بہ نسبت نظر بھی اسی پر زیادہ ہے، دوسری قوموں کے لیے ممکن ہے یہ نفع ونقصان کا میزان ہو، جس میں ذات پات، علاقہ اور اس سے بھی زیادہ اقتدار کی بدولت حصول دولت ومناصب کے مواقع کو وزن حاصل ہو لیکن امت مرحومہ کے لیے اب تک کے تمام انتخابات کی طرح اصل مسئلہ، اپنے وجود، مذہب اور تہذیب کے تحفظ ہی کا ہے، ایسے اہم مسئلہ کے لیے زاویہ فکر ونظر کے علاوہ لائحہ عمل کی درستی وراستی عین مقصود ہے، لیکن مسلسل صدمات کے باوجود ماضی کے تلخ تجربوں سے سبق لینے کا جذبہ اور صحیح فیصلہ لینے کی خواہش بظاہر نظر نہیں آتی، قوم کی بقا اور ترقی کے ترانوں سے فضا پرشور تو ہے لیکن راگ اور سُر اتنے جدا جدا ہیں کہ ساز ہستی چھیڑنے والے جیسے چھپ گئے اور اب بس آواز ہی آواز ہے۔

موجودہ سیاست کی نیرنگیوں اور اس کی فسوں سازیوں سے ہم زیادہ واقف نہیں لیکن معارف کے ذریعہ اس کے پاک نہاد بزرگوں نے ہمیشہ اس سوال پر اپنی نظر مرکوز کی کہ ہماری قوم کی روح ومصدر کون سی قوت بن سکتی ہے؟ اور دراصل ترقی ہے کیا؟ جواب یہی رہا کہ ترقی صرف اس روح کا نام ہے جو قوموں کو زندہ کر کے ان کے ہر رگ وریشہ میں جدوجہد اور سعی وعمل کی تڑپ پیدا کر دیتی ہے، وہ تمام قوم میں کسی متفقہ غرض کے حصول کی خاطر ہر قسم کی تکلیف ومشقت کی برداشت کی قوت پیدا کرتی ہے، ترقی کسی خاص مادی مظہر کا نام نہیں بلکہ یہ وہ بجلی ہے کہ جب کسی قوم کے افراد میں کوند جاتی ہے تو ہر ایک کے دست وبازو میں اپنے فرائض

کے بجالانے کی استعداد پیدا کر کے نشو و نما اور تکمیل کے لیے بیدار کر دیتی ہے، یہ روح بھی کوئی پوشیدہ اور نایاب شے نہیں، قادر مطلق پر یقین اور آخری ہادیٔ انسانیت کی تعلیم ہی ہماری قوت کی روح ہے، جب تک اس کا جذبہ ہماری فکر اور عمل کا لازمی عنصر نہیں ہوگا، ہماری کراہ بے آواز اور ہمارا شور بے زور ہی رہے گا۔

مسائل اور مصائب، قوموں کی زندگی کا بہر حال حصہ ہیں، سنجیدگی، استقلال، سلامت روی اور صبر کے ساتھ ہی ان سے نبرد آزما ہوا جا سکتا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ ایک صدی اور بالخصوص ملک کی آزادی کے بعد کی تاریخ میں جن جماعتوں میں ان صلاحیتوں کا کچھ نہ کچھ ظہور ہوا ان میں بجا طور پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا نام لیا جا سکتا ہے، وقتی اشتعال اور سیمابی و سیلابی جوش کی جگہ، ہوش و استقلال اور مسائل کے حل کے لیے متانت و وقار گویا اس بورڈ کا شعار ہے، اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، لیکن ادھر کچھ مسائل حکومت وقت کی نافہمی اور حقیقتوں سے لاعلمی کی وجہ سے سامنے آئے، ان کی سنگینی سے خود قوم بھی دوسرے ہنگامہ ہائے شور وشر کی وجہ سے غالباً ناواقف ہی ہے لیکن مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی قیادت میں بورڈ کے ہوش مندوں کی نظر ان مسائل پر بروقت پڑی جیسے ملک میں مفت لازمی تعلیم کا قانون، RTE کے نام سے اس قانون کو بنانے والوں کی نظر میں یہ مفید ہی نہیں انقلابی قانون ہے، بظاہر اس کی افادیت سے یوں انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تعلیم کے حصول اور بچوں کو بنیادی طور خواندہ بنانے کے لیے ہے لیکن اس خوش کن مبتدا کی خبر اتنی ہی وحشت ناک ہے یعنی تجلی سے زیادہ یہ برق دینی مدارس کے نظام پر گر کر ان کو خاکستر بنا دے گی، اس قانون سے مدارس کی شکل کیا ان کا وجود ہی نہیں رہ پائے گا اور خود یہ قانون، دستور ہند کی اس دفعہ کو مہمل کر دے گا جس کی رو سے اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے بنانے اور اپنا نصاب چلانے کا حق دیا گیا ہے، اب ان ہی اسکولوں میں لازمی تعلیم ہوگی جن کو حکومت کھولے گی یا بڑے تجارتی گھرانے، اس کا واضح مطلب ہے کہ چھ سال سے چودہ سال کے بچوں کے لیے حکومت کی شرائط ہی قابل عمل ہوں گی، یعنی اب مدارس کے چلانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں، یہ تو ایک پہلو ہے ورنہ اس قانون میں دوسری دفعات ایسی ہیں جو نصاب اور ذریعۂ تعلیم کے سلسلے میں مسلمانوں کے لیے سم قاتل اور بعض دفعات مسلمانوں کے علاوہ دوسروں کے لیے مضحکہ خیز بھی ہیں جیسے معیار تعلیم کہ لازمی تعلیم کے اس دور میں بچوں کو کسی بورڈ کا امتحان پاس کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی وغیرہ۔ اسی طرح وقف کے قانون میں ترمیم کے لیے ایک بل پیش کیا گیا ہے جس کی

ایک اہم شق یہ ہے کہ جو وقف، رجسٹرڈ نہیں ہوں گے ان کو عدالت میں اپنے دفاع یا چارہ جوئی کا حق نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ اگر سو دو سو سال پرانی مسجد ہے اور وہ وقف بورڈ میں درج نہیں تو عدالت کی نظر میں کوئی قانونی حیثیت نہیں اس کو اگر توڑ ڈالا جائے تو یہ ایک عام اجتماعی عمارت کا توڑنا ہوگا، اللہ کے گھر کو نہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ رجسٹریشن کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کا مطالبہ ہے کہ غیر رجسٹرڈ وقف عدالتی چارہ جوئی سے محروم نہ ہوں، اسی طرح حکومت کی جانب سے انکم ٹیکس ایکٹ کو منسوخ کر کے ڈائریکٹ ٹیکسز کوڈ کے نفاذ کی تیاری ہے، انکم ٹیکس کے قانون کی رو سے مذہبی ٹرسٹ مذہبی ادارے اور عبادت گاہیں ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں لیکن نئے قانون کے تحت یہ تمام مذہبی ادارے انکم ٹیکس ادا کرنے کے لیے مجبور ہوں گے، اس قانون کی زد پر گو ہر مذہبی ادارہ ہے لیکن تشخص اور شناخت بلکہ اپنے مذہبی وجود کے تحفظ اور بقا کے لیے جس قوم کے لیے ہر قدم اور ہر لمحہ قیامت خیز ہے، وہ مسلمان ہی ہیں، ایسے میں اس قانون کا اصل ہدف کون ہے؟ اس کا جواب آسان بھی ہے اور ظاہر بھی۔ شکر ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے ان قوانین کے انجام بد پر نظر کی اور بڑے سلیقے سے اپنے خدشات اور مطالبات کا اظہار ایوان حکومت میں کر بھی دیا، بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا محمد ولی رحمانی اور جناب عبدالرحیم قریشی نے یہ ذمہ داری بھی لی کہ خود مسلمانوں کو ان قوانین کے مالہ وماعلیہ سے باخبر کرائیں، بیدار ہونے اور خبردار رہنے کا یہی عمل مطلوب ہے، انتخابی سیاست سے بورڈ کے اجتماعی شعور کا تعلق نہیں ہے لیکن انتخابات کے ماحول میں جہاں مطالبات اور حقوق موقع کے منتظر رہتے ہیں، وہیں سیاسی جماعتوں کو ان کے فرائض اور دستور کے تحفظ کی اہمیت یاد دلانا بھی ضروری ہے، شطرنج کی بساط ضرور بچھے، کھیل بھی ہو لیکن مات دینے سے زیادہ مات کھانے کا احساس بھی ضروری ہے اور یہ کام تماش بین اگر کرتے ہیں تو اس کو اور کوئی نام دینے کی ضرورت نہیں۔

افسوس گذشتہ دنوں اردو کے شیدائی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس دنیا سے رخصت ہوگئے، سرزمین اردو حیدرآباد میں پیدا ہوئے، ساری عمر اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے جدوجہد کرتے رہے لیکن اردو سے بچپن سے جو رشتہ قائم ہوا تادم آخر اس کی حفاظت کرتے رہے، دارالمصنّفین سے محبت رکھتے تھے، کئی بار یہاں آئے اور خوش ہو کر گئے، ان کی شائستہ شخصیت مشرقی قدروں کا دلکش نمونہ تھی، افسوس ایسے لوگ کم ہوتے جاتے ہیں، افسوس اس کا بھی ہے کہ ہم نے اپنے غم اور اردو کے نقصان کا اظہار تاخیر سے کیا۔

مقالات

تصوف کیا ہے

پروفیسر الطاف احمد اعظمی

تصوف کے بارے میں مسلمانوں میں واضح طور پر دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ پہلا گروہ عوام کا ہے جو جہل و نادانی اور علمائے سو کی غلط رہنمائی کی وجہ سے یہ خیال رکھتے ہیں کہ اللہ نے بعض صوفیاء کو جنہیں وہ اولیاء اللہ کہتے ہیں، تصرف کا اختیار بخشا ہے اور وہ انسانوں کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ برصغیر ہند و پاک کے اکثر مشاہیر صوفیاء کے مقابر پر یہ نادان مسلمان حاضری دیتے ہیں، ان سے حاجت روائی کے لیے دعائیں کرتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ وہاں سجدے تک کیے جاتے ہیں۔ اس کھلے ہوئے فعلِ شرک کے ارتکاب کے باوجود وہ اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیے گئے ہیں کہ ان کے یہ اعمال خلاف توحید نہیں ہیں۔

دوسرا گروہ خواص یعنی اہل علم کا ہے جو تصوف کے باب میں مختلف الرائے ہیں۔ ایک طبقے کا خیال ہے اور ان کی تعداد زیادہ ہے کہ تصوف عین اسلام ہے، اس میں ایسی کوئی بات نہیں جو دین اسلام کے خلاف ہو۔ وہ باطن کی اصلاح کرتا ہے۔ ان کی اصطلاح میں اس تصوف کا نام طریقت ہے۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا طبقہ ہے جو تصوف کا شدت کے ساتھ منکر ہے، اس کی نظر میں وہ ایک بدعت ہے جو دوسرے مذاہب سے لے لی گئی ہے۔ بہت سے علمائے ظاہر اور اہل حدیث اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اہل علم کا ایک تیسرا گروہ بھی ہے جس کا خیال ہے کہ تصوف کا ایک حصہ اسلامی ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کو حدیث میں احسان کہا گیا ہے، البتہ اس کا دوسرا حصہ جو عجمی فکر سے ماخوذ ہے، غیر اسلامی ہے۔

اس اختلاف کے پیش نظر یہ بات مناسب معلوم ہوتی ہے کہ خود صوفیائے کرام سے

آر زیڈ ۹۰۱ بی، فلیٹ نمبر ۴۰۲، گلی نمبر ۲۴، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی -۱۹۔

رجوع کیا جائے کہ وہ تصوف کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

معنی و مفہوم: شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ (م ۴۶۰ھ/ ۱۰۳۷ء) بڑے پایہ کے صوفی گزرے ہیں اور لاہور میں مدفون ہیں۔ وہ تصوف اور صوفی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اس اسم کی تحقیق میں بہت سے اقوال بیان کیے گئے ہیں اور بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اہل تصوف کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ صوف کا لباس پہنتا ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ برگزیدگی میں صف اول میں ہوتا ہے۔ ایک تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس کو صوفی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اصحاب صفہ سے محبت کرتا ہے، ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ لفظ صفا سے مشتق ہے''۔(۱)

آگے مزید فرماتے ہیں:

''اس لفظ کی تحقیق کے سلسلے میں ہر شخص نے لطیف اشارات کیے ہیں لیکن لغوی اعتبار سے وہ سب حقیقی معنی سے دور ہیں، فی الواقع صفا (۲) (صفائی) ان سب میں زیادہ محبوب ہے اور اس کی ضد کدورت ہے...... چونکہ اہل تصوف نے اپنے اخلاق و معاملات کو درست کرلیا اور طبیعت کی آفت سے بیزاری اختیار کرلی ہے اس لیے ان لوگوں کو صوفی کہتے ہیں''۔(۳)

اس سلسلے میں علامہ ابن خلدونؒ (م ۷۵۰/ ۱۳۴۹ء) کی رائے ہے کہ یہ صوف سے مشتق ہے (۴)۔ علامہ ابن تیمیہؒ (م ۷۲۸ھ) کا بھی یہی خیال ہے (۵)۔ دوسرے محققین نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔(۶)

معلوم ہوا کہ صوفی وہ لوگ تھے جو صوف کا لباس زیب تن کرتے تھے اور اس سے ان کا مقصود دنیا سے بے نیازی اور فقر کا اظہار تھا۔ شیخ ہجویریؒ فرماتے ہیں:

> ''تمام صحابہ صوف کا لباس پہنتے تھے جس سے فقر اور بے نیازی کا اظہار مقصود تھا۔ ایک روایت ہے: علیکم بلبس الصوف تجدون حلاوۃ الایمان فی قلوبکم ''تم صوف کا لباس پہنا کرو، اپنے دلوں میں ایمان کی حلاوت پاؤ گے''۔(۷)

لیکن دوسرے صوفیاء کے یہاں صوفی کا مفہوم اس سے کچھ زیادہ تھا چنانچہ جب ذوالنون مصری (م ۲۴۵ھ/۸۵۹ء) سے اس کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا:

''وہ لوگ صوفی ہیں جنہوں نے تمام کائنات میں صرف اللہ کو پسند کیا''۔(۸)

سہل بن عبداللہ تستری (م ۲۸۳ھ/۸۹۶ء) فرماتے ہیں:

''صوفی وہ ہے جس کا دل کدورت سے خالی اور تشکر سے بھرا ہو اور قرب الٰہی کی طلب میں بشر سے منقطع ہو اور اس کی آنکھوں میں خاک اور سونا برابر ہو''۔(۹)

یہ قول بھی ان ہی کا ہے:

''تصوف کے معنی ہیں، کم کھانا، خدا سے قربت حاصل کرنا اور مخلوقات سے بھاگنا''۔(۱۰)

ابوالحسن نوری (م ۲۹۵ھ/۹۰۸ء) کا قول ہے: ''صوفی وہ لوگ ہیں جن کی روح بشریت کی کدورت سے آزاد اور آفت نفس سے پاک ہو اور ہوس سے آزاد ہو چکی ہو'' (۱۱)۔ ان ہی کا یہ قول بھی ہے: ''صوفی وہ ہے جس کی فکر میں کوئی دوسری چیز نہ آئے اور نہ ہی وہ کسی چیز کی فکر میں ہو کیونکہ تصوف نہ علو کا نام ہے نہ رسوم کا بلکہ اخلاق کا نام ہے۔ اگر یہ رسم ہوتا تو مجاہدہ سے حاصل ہو جاتا اور اگر علم ہوتا تو تعلیم سے حاصل ہوسکتا'' (۱۲)۔ ان کا ایک تیسرا قول بھی ملاحظہ ہو: ''تصوف دنیا کی دشمنی اور مولیٰ کی دوستی کا نام ہے''۔(۱۳)

جنید بغدادیؒ (م ۲۹۷ھ/۹۱۰ء) جن کا پایہ تصوف میں بہت بلند ہے، فرماتے ہیں:

''صوفی وہ ہے جس کا دل دنیا سے متنفر اور فرمان الٰہی کو ماننے والا ہو، اس میں حضرت اسماعیلؑ کی تسلیم، حضرت داؤدؑ کا اندوہ، حضرت عیسیٰؑ کا فقر، حضرت ایوبؑ کا صبر، حضرت موسیٰؑ کا شوق اور رسول خداؐ کا اخلاق ہو''۔(۱۴)

ابوبکر شبلی (م ۳۳۴ھ/۹۴۶ء) کا ارشاد ہے:

''صوفی وہ ہے جو خلق سے منقطع اور حق سے متصل ہو''۔(۱۵)

تصوف کے بارے میں جلیل القدر صوفیاء کی مذکورہ بالا تشریحات سے بالکل واضح ہو گیا کہ ابتدائی دور کے تصوف میں زہد و عبادت میں غلو اور ترک دنیا (رہبانیت) کا مفہوم غالب تھا۔

صوفیاء درحقیقت مسلم قوم کے رہبان تھے۔ رہبانیت کی طرف ان کے میلان کی وجہ کچھ تو طبعی تھی اور کچھ دوسرے مذاہب بالخصوص عیسائیت اور بدھ مذہب کے اثرات کا بھی اس میں دخل تھا۔

آگے چل کر تصوف کے مفہوم میں ایک اور خارجی اضافہ ہوا یعنی مشاہدۂ حق۔ اس کا مطلب یہ بیان کیا گیا کہ دل کو خدا کے ماسوا خیال سے پاک رکھا جائے اور اسی غرض سے مراقبہ کا طریقہ رائج ہوا۔ لیکن آگے چل کر اصلاح خیال کا مطلب یہ ہوگیا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور چیز کو نہ دیکھا جائے۔ پھر اس خیال میں مزید ترقی ہوئی تو کہا گیا کہ خدا کے سوا اس دنیا میں کوئی اور وجود موجود ہی نہیں ہے۔ کسی نے حضرت شبلی سے تصوف کے بارے میں پوچھا تو فرمایا:

> ''تصوف شرک ہے، اس لیے کہ تصوف نام ہے دل کو مشاہدۂ غیر سے محفوظ رکھنے کا حالانکہ یہاں غیر کا وجود ہی نہیں''۔ (۱۶)

اسی عجمی فکر کی انتہائی ترقی یافتہ صورت کا نام وحدت الوجود ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''ہمعات'' میں تصوف کے جن چار ادوار کا ذکر کیا ہے ان سے تصوف کے مذکورہ ارتقائی مفہومات کی تائید ہوتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ تصوف کا دوسرا دور رہبانیت کا ہے اور اس دور میں تعلق مع اللہ کی مضبوطی کے لیے بڑی بڑی ریاضتیں کی گئیں اور ذکر وفکر میں انہماک کافی بڑھ گیا۔ تیسرا دور ''توجہ'' کا ہے، یعنی نفس کا پورے طور پر حقیقت الحقائق یعنی ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہونا۔ لیکن یہ توجہ ابھی کاملیت کے درجہ تک نہیں پہنچی تھی۔ اس کی تکمیل چوتھے درجہ میں ہوئی (۱۷)۔ اس درجے کے متعلق شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''آخر میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی اور ان سے کچھ پہلے کا زمانہ آتا ہے۔ اس عہد میں ان اہل کمال بزرگوں کے ذہنوں میں مزید وسعت پیدا ہوتی ہے اور یہ لوگ کیفیات واحوال کی منزل سے آگے بڑھ کر حقائق تصوف کی بحث وتدقیق کرنے لگے۔ ذات واجب الوجود سے یہ کائنات کس طرح صادر ہوئی؟ ان بزرگوں نے ظہور وجود کے مدارج وتنزلات دریافت کیے اور اس امر کی تحقیق کی کہ واجب الوجود سے پہلے کس چیز کا صدور ہوا اور کس طرح یہ شدور عمل میں آیا''۔ (۱۸)

تصوف دین میں اضافہ ہے: اوپر تصوف کے معنی و مفہوم کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ تصوف درحقیقت دین میں اضافہ ہے۔ ہر مسلمان کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ دین اسلام ایک مکمل دین ہے، اس میں کسی پہلو سے کوئی کمی نہیں ہے، نہ فکر کے اعتبار سے اور نہ ہی عمل کے لحاظ سے اور اس حقیقت کا اعلان بھی کردیا گیا ہے۔ فرمایا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (سورہ مائدہ:۳)	آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کردی اور اسلام کو تمہارے لیے بطور دین پسند کرلیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اب اگر کوئی شخص اس دین میں کوئی نئی چیز داخل کرتا ہے تو گویا اپنے اس فعل سے اللہ کے اس قول کی تکذیب کرتا ہے کہ دین مکمل کردیا گیا ہے۔ چنانچہ نبیؐ نے فرمایا ہے:

فان خير الحديث كتاب الله وخير الهدى هدى محمد و شر الامور محدثاتها ...... وكل بدعة ضلالة (۱۹)	بہترین کلام (یعنی کتاب) اللہ کی کتاب ہے اور بہترین ہدایت محمد (ﷺ) کی (دکھائی ہوئی) ہدایت (کی راہ) ہے اور جو نئی باتیں دین میں پیدا کی جائیں وہ سب سے بری ہیں اور ہر نئی بات گمراہی ہے۔

ایک دوسری روایت ہے:

من احدث في امرنا هذا ما ليس منه فهو رد (۲۰)	جو ہمارے دین میں کوئی نئی چیز لائے وہ قابل رد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ دین میں کسی نئی چیز کی شمولیت کو خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، سخت ناپسند کرتے اور اس کو بدعت قرار دیتے تھے۔ دارمی نے حکم بن مبارک سے روایت کی ہے: وہ کہتے ہیں کہ ہمیں عمرو بن یحییٰ نے خبر دی، وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنے والد سے سنا، وہ اپنے والد سے نقل کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم نماز فجر سے پہلے عبداللہ بن مسعودؓ کے دروازے پر بیٹھ جاتے تھے۔ جب وہ گھر سے نکلتے تو ہم ان کے ساتھ مسجد میں جاتے تھے۔ ایک روز ابن مسعودؓ

کے مکان پر ابوموسیٰ اشعریؓ آئے اور ہم سے پوچھا کہ کیا ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ ابن مسعود) گھر سے نکلے۔ہم نے جواب دیا کہ ابھی نہیں نکلے۔ یہ سن کر وہ ہمارے پاس بیٹھ گئے، یہاں تک کہ عبداللہ ابن مسعودؓ گھر سے نکلے اور ہم لوگ اٹھ کر ان کے ساتھ چلے۔

پھر ان سے ابوموسیٰ نے کہا، اے ابوعبدالرحمٰن ! میں نے ابھی مسجد میں ایک نئی بات دیکھی مگر الحمدللہ اچھی بات دیکھی۔عبداللہ ابن مسعودؓ نے پوچھا، تم نے کیا دیکھا۔ابوموسیٰ نے کہا کہ اگر مسجد پہنچنے تک آپ زندہ رہے تو خود دیکھ لیں گے۔ پھر کہا، میں نے مسجد میں لوگوں کو دیکھا کہ وہ جدا جدا حلقے بنا کر بیٹھے ہیں اور نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر حلقہ میں ایک شخص ہے جس ہاتھ میں سنگ ریزے ہیں، وہ کہتا ہے کہ سو مرتبہ اللہ اکبر کہو، سب لوگ سو بار اللہ اکبر کہتے ہیں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ سو بار سبحان اللہ کہو، سب لوگ سو بار سبحان اللہ کہتے ہیں۔

یہ سن کر عبداللہ ابن مسعودؓ نے پوچھا کہ پھر تم نے ان سے کیا کہا۔ابوموسیٰ نے جواب دیا، آپ کی رائے اور حکم کے انتظار میں میں نے کچھ نہیں کہا۔انہوں نے کہا، تم نے کیوں نہ ان کو حکم دیا کہ ان سنگ ریزوں پر تکبیر وتہلیل اور تسبیح کے بجائے وہ لوگ اپنے اپنے گناہوں کو شمار کریں اور تم نے ان سے اس بات کی ذمہ داری کیوں نہ لی کہ ان کی نیکیوں میں سے کچھ ضائع نہ ہوگا۔

یہ کہہ کر ابن مسعود چلے اور ہم سب ان کے ساتھ چلے، یہاں تک کہ وہ ان حلقوں میں سے ایک حلقہ کے پاس پہنچ کر ٹھہر گئے اور ان لوگوں سے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ اے ابوعبدالرحمٰن ! ہم ان سنگ ریزوں سے تکبیر وتہلیل وتسبیح کے کلمات شمار کرتے ہیں۔ ابن مسعود نے کہا، اس کے بجائے تم لوگ اپنے اپنے گناہوں کو شمار کرو اور میں ضامن بنتا ہوں کہ تمہاری نیکیوں میں سے کوئی نیکی ضائع نہ ہوگی۔اے امت محمد! تمہارا برا ہو، تمہاری ہلاکت کتنی جلد آگئی۔ابھی تمہارے نبی کے اصحاب کثرت سے موجود ہیں، تمہارے نبی کے کپڑے ابھی بوسیدہ نہیں ہوئے ہیں اور آپ کے برتن ابھی نہیں ٹوٹے مگر تم ابھی سے بدعتیں ایجاد کرنے لگے۔ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، یا تو تم ایک ایسے دین پر ہو جو محمدؐ کے دین سے زیادہ راہ راست پر ہے یا تم گمراہی کے دروازے تک پہنچ گئے ہو اور وہ دروازہ کھلنے والا ہے۔

ان لوگوں نے یہ سن کر جواب دیا، اے ابوعبدالرحمٰن ! خدا کی قسم ہم اس فعل سے نیکی ہی

کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ابن مسعود نے کہا، بہت سے نیکی کا ارادہ کرنے والے ایسے ہیں کہ انہیں نیکی نہیں ملتی۔ رسول خدا نے ہم سے فرمایا ہے کہ ''بہت سے لوگ قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کے گلے سے آگے نہیں بڑھے گا۔ خدا کی قسم، میں نہیں جانتا، شاید تم میں اکثر ایسے لوگ ہوں''۔ (۲۱)

اصحاب رسول کے مذکورہ فعل میں بظاہر کوئی خرابی نہیں تھی۔ وہ سنگ ریزوں پر اللہ اکبر اور سبحان اللہ کہہ کر اللہ کی تکبیر وتمجید ہی تو کر رہے تھے لیکن جلیل القدر صحابیِ رسول عبداللہ ابن مسعود نے صرف اس وجہ سے اس بات کو ناپسند کیا کہ نبیؐ کے دین میں یہ ایک نئی بات تھی، یہ ایک بدعت تھی۔ اگر وہ اس سے سکوت اختیار کرتے تو لوگ آگے چل کر اسی طرح کی دوسری بدعتیں نیکی کا نام لے کر خدا کے آخری دین میں داخل کر دیتے اور پھر یہ بدعتوں کے انبار میں گم ہو کر لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جاتا۔

اس سلسلے میں درج ذیل روایت بھی قابل ملاحظہ ہے:

سمعني ابي وانا في الصلوٰة اقول :	میرے باپ نے نماز میں مجھے کہتے ہوئے سنا
بسم اللّٰه الرحمٰن الرحيم ، فقال	''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''، تو مجھ سے کہا، میرے
لي ، اي بنّي محدث ، اياك	بیٹے! یہ نئی چیز ہے اور تم کو لازم ہے کہ نئی چیز
والحدث (۲۲)	سے بچو۔

جس دین میں ذکر الٰہی کے ایک نئے طریقے کو سخت ناپسند کیا گیا وہ ان باتوں کو کیسے پسند کرے گا جو صوفیاء نے ریاضات اور مجاہدات کی غرض سے اس دین میں داخل کر دی ہیں (۲۳)۔ انہوں نے ایک دو بدعتیں نہیں، مراقبہ، چلہ کشی اور اوراد و وظائف کے نام سے بدعتوں کا انبار لگا دیا ہے (۲۴)۔ اتنا ہی نہیں انہوں نے زہد و عبادت میں غلو اور مشاہدۂ حق کے نام سے دین اسلام میں جو عملی اور فکری اضافے کیے ہیں وہ اس کے تصور ایمان و عمل کے سراسر خلاف ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان اضافات کو تفصیل سے بیان کیا جائے۔

غلو فی الزہد: کوئی دینی عمل بذات خود کتنا ہی اچھا ہو لیکن اگر وہ اعتدال کے دائرے سے باہر نکل جائے تو ناپسندیدہ بن جاتا ہے۔ دیکھیں کہ عیسائی رہبان نے محض خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے رہبانیت کا راستہ اختیار کیا لیکن اس کے باوجود اللہ نے ان کے اس فعل کو

ناپسند کیا۔قرآن کے الفاظ ہیں:

وَ رَهۡبَانِيَّةَ نِ ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (سورہ حدید:۲۷)	اورانہوں نے رہبانیت (یعنی ترک دنیا) ایجاد کرلی، ہم نے اس کوان پرواجب نہیں کیا تھا مگر انہوں نے محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کیا، پھرانہوں نے اس کواس طرح نہیں نبھایا جس طرح اس کے نبھانے کا حق تھا۔

خود نبیؐ نے فرمایا ہے:" لا رهبا نية فى الاسلام"(۲۵)(اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں)۔ایک بارصحابہ کی ایک جماعت نبیؐ کی عبادت کا حال معلوم کرنے ازواج مطہرات کے گھر پہنچی۔ان کا گمان تھا کہ آپؐ رات بھرنمازیں پڑھتے ہوں گے، ہر دن روزے رکھتے ہوں گے،رات میں کم سوتے ہوں گے،جسم کوکم آرام دیتے ہوں گےاورعورتوں سےکوئی تعلق نہ رکھتے ہوں گے۔لیکن جب ازواج مطہرات نے نبیؐ کی عبادت کے بارے میں بتایا تو وہ ان کے اندازے سے کم معلوم ہوئی۔انہوں نے کہا کہ ہم کوحضورؐ سے کیا نسبت،اللہ نے آپؐ کی مغفرت فرمادی ہے(وقد غفر الله ما تقدم من ذنبه وما تاخر)۔ان میں سےایک نے کہا کہ میں ساری رات نماز پڑھوں گا، دوسرے نے کہا، میں عمرروزے رکھوں گےاورکبھی ناغہ نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا، میں عورتوں سے الگ رہوں گا اورکبھی شادی نہ کروں گا۔رسول اللہؐ نے جب ان کی یہ باتیں سنیں توان کے پاس آئے اور فرمایا:

انتم القوم الذين قلتم كذا و كذا؟	کیاوہ تمہیں لوگ ہوجنہوں نے اس قسم کی باتیں کی ہیں۔
و اللّٰه انى لاخشاكم اللّٰه واتقاكم له ، لكنى اصوم و افطر، واصلى وارقد، واتزوج النساء، فمن رغب عن سنتى فليس منى (۲۶)	خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں اوراس کی نافرمانی سے احتراز کرتا ہوں،تاہم میں روزہ بھی رکھتا ہوں اورناغہ بھی کرتا ہوں،راتوں میں نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اورعورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔تو جو میرے طریقے سے ہٹ گیااس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

قرآن اور نبیؐ کی ان واضح تعلیمات کے باوجودصوفیاء نے رہبانیت کی راہ اختیار کی اور

عیسائی رہبان کی طرح عبادت میں غلو کیا۔ ایک صوفی بزرگ بیس سال تک مستقل کھڑے رہے، صرف نماز میں تشہد کے لیے بیٹھتے تھے (۲۷)۔ سریؒ ایک بڑے عبادت گزار صوفی گزرے ہیں۔ وہ اٹھانوے برس تک زندہ رہے اور کہا جاتا ہے کہ سوائے مرض الموت کے کبھی لیٹے نہیں (۲۸)۔ ایک چشتی بزرگ خواجہ ابو محمد اپنے مکان کے ایک گہرے کنویں میں الٹا لٹک کر عبادت میں مصروف رہتے تھے (۲۹)۔ مشہور ہندوستانی صوفی شیخ فریدالدین گنج شکر نے بھی کنویں میں لٹک کر چلہ کشی کی تھی۔

اس خلاف سنت عمل سے کہیں زیادہ ناپسندیدہ وہ توجیہ ہے جو مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے ممتاز عالم دین اور شیخ طریقت نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''الٹا لٹک کر عبادت کرنا فی نفسہ یہ ایک فعل مباح ہے جو کسی مباح مصلحت سے مباح ہے۔ جیسے کسی غریق کو الٹا لٹکا دینا جس سے پیٹ کا پانی نکل جائے بالاجماع مباح ہے۔ حضرت ابولبابہ انصاری کا ایک غلطی پر اپنے کو ستون سے باندھ دینا اور چھے روز تک بندھا رہنا، صرف نماز کے وقت ان کی بی بی کا کھول دینا، پھر نزول توبہ کے بعد مستقلاً حضور کا کھول دینا اس اباحت کی دلیل ہے''۔ (۳۰)

راقم اس تاویل پر کوئی تبصرہ نہیں کرے گا۔ لیکن اس قدر واضح ہے کہ علماء کو فن تاویل میں کمال حاصل ہے، وہ بہت آسانی سے آسمان کو زمین اور زمین کو آسمان ثابت کر سکتے ہیں۔

زہد میں صوفیاء کے غلو اور شدت پسندی کا ذکر کرتے ہوئے ابن جوزی لکھتے ہیں:

منهم لا يزيد على خبز الشعير ومن هم من لا يذوق الفاكهة ، ومنهم من يقلل الطعام حتى ييبس بدنه ويعذب نفسه بلبس الصوف وبمنعها الماء البارد ، ما هذه طريقة رسول الله ولا طريق اصحابه واتباعهم ، وانما	بعض جو کی روٹی پر گزر کرتے ہیں اور بعض پھل نہیں کھاتے، بعض بہت قلیل غذا لیتے ہیں یہاں تک کہ بدن سوکھ جاتا ہے، وہ اپنے نفس کو اونی کپڑے پہن کر اور ٹھنڈا پانی استعمال نہ کرکے سزا دیتے ہیں۔ یہ اللہ کے رسول اور آپ کے اصحاب کا طریقہ نہیں۔ جب ان کو کچھ نہ ملتا تو بھوکے

کانوا یجوعون اذا لم یجدوا شیئا فاذا وجدوا اکلوا (۳۱)	رہتے اور جب مل جاتا تو کھاتے تھے۔

آگے مزید لکھا ہے:

وقد کان فیھم قوم لا یاکلون اللحم حتی قال بعضھم ، اکل درھم من اللحم یقسی القلب اربعین صباحا ، وکان فیھم من یمتنع من الطیبات کلھا (۳۲)	ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو گوشت نہیں کھاتے یہاں تک کہ بعض نے کہا کہ ایک درہم کے برابر گوشت کھانا چالیس دن (صبح) کے لیے دل کو سخت کر دیتا ہے اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو جملہ پاکیزہ غذاؤں سے احتراز کرتے ہیں۔

توکل کے معاملے میں بھی بہت سے صوفیاء نے غلو کیا ہے اور اسباب و تدابیر کی نفی کی ہے۔حضرت جنید بغدادیؒ سے کچھ لوگوں نے پوچھا کہ رزق کہاں تلاش کیا جائے؟ تو انہوں نے جواب دیا ''اگر تمہیں معلوم ہے تو وہاں اسے تلاش کرو''۔لوگوں نے پوچھا کہ اللہ سے سوال کریں؟ انہوں نے کہا ''اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اس نے تمہیں فراموش کر دیا ہے تو پھر اس کو ضرور یاد دلاؤ''۔ انہوں نے پھر پوچھا کہ کیا ہم توکل کے خیال سے اپنے گھروں میں بیٹھ جائیں؟انہوں نے جواب دیا ''تجربہ کرنا شک کے مرادف ہے''۔آخر میں پوچھا گیا کہ پھر کیا تدبیر اختیار کی جائے؟انہوں نے کہا ''ترک تدبیر''۔(۳۳)

یہی خیال امام غزالیؒ کا تھا،فرماتے ہیں:

''توکل کے تین درجے ہیں، پہلا درجہ یہ ہے کہ اللہ پر وثوق ہو جیسا کہ امانت دار، مہربان، شفیق، درست کار وکیل پر ہوتا ہے، دوسرا یہ کہ اللہ کے ساتھ ایسا معاملہ ہو جیسے بچے کا ماں کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ اس کے سوا کسی کو نہیں جانتا اور اسی کی طرف ہر بات میں رجوع کرتا ہے اور سب سے پہلے اسی کا خیال اس کے دل میں آتا ہے۔یہ مقام ترک دعا اور ترک سوال غیر اللہ کو چاہتا ہے کیونکہ وہ شفیق و کریم ہے۔اب آپ سوال کریں گے کہ کیا بندے کا اسباب و تدابیر کے ساتھ کوئی تعلق رہ جاتا ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ تیسرا مقام تدبیر کی نفی کرنا ہے،

البتہ اللہ سے دعا اور بچے کی طرح تضرع وزاری کر سکتا ہے''۔(۳۴)

امام موصوف نے اپنی کتاب ''منہاج العابدین'' میں صاف طور پر لکھا ہے کہ انسانی رزق مقدر وموَقت ہے اس لیے رزق اور اسباب رزق کی جستجو تحصیل لا حاصل ہے، فرماتے ہیں:

فتبین لك ان طلب الرزق واسبابه	تم پر یہ بات واضح ہو چکی کہ رزق اور اسباب
لیس بامر لازم للعبد (فان قلت)	رزق کی تلاش بندے کے لیے ضروری نہیں ہے۔
هل یزید الرزق بالطلب وهل	(اگر تم کہو) کیا تلاش وجستجو سے رزق میں اضافہ
ینقص بترك الطلب فاعلم انه	اور اس کے ترک سے کمی واقع ہوتی ہے؟ تو جان
مکتوب فی اللوح المحفوظ مقدر	لو کہ رزق لوح محفوظ میں لکھا جا چکا ہے، وہ مقدر
و مؤقت ولا تبدیل لحکم الله ولا	اور موَقت ہے اور اللہ کا فیصلہ نا قابل تبدیل ہے
تغیر لقسمته و کتابته (۳۵)	اور اس کی تقسیم اور اس کے لکھے میں کوئی ترمیم و تغیر ممکن نہیں ہے۔

ایک ہندوستانی صوفی حکیم شیخ صدرالدین دہلوی (۳۶) نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ''اخبار الاخیار'' میں ان کا ایک خط درج کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

''یقین کرلو کہ زندگی اور رزق مقرر ہے جو دوڑ دھوپ کرنے سے کم و بیش نہیں ہوتا۔ جب کہ رزق کسی شرط پر نہیں دیا جاتا تو بہتر ہے کہ عمر کو طلب حق میں مشغول رکھا جائے اور سلوک کی آخری منزل طے کی جائے۔ سب جاندار اللہ کے بندے ہیں جن کو رزق دینا اللہ کا کام ہے جیسا کہ اللہ نے خود فرمایا ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا ......اے برادر جواں ہمت جو کوئی اس کا یقین نہ کرے وہ مومن نہیں کافر ہے''۔(۳۷)

ذوالنون مصری کے نزدیک ترک تدبیر ہی حقیقی توکل ہے۔ اپنے بحری سفر کا ایک واقعہ انہوں نے اس طرح بیان کیا ہے:

سافرت سنین وما صح لی التوکل	میں نے برسوں سفر کیا لیکن حقیقی توکل تک صرف

الا وقتا واحدا رکبت البحر فکسر المرکب فتعلقت بخشبة من خشب المرکب فقالت لی نفسی، ان حکم اللّٰه علیك بالغرق فما تنفعك هذه الخشبة ، فخلیت الخشبة ، فطفت علی المآء فوقعت علی الساحل لَکُمْ (۳۸)	ایک بار پہنچ سکا۔ایک بحری سفر کے دوران میرا جہاز شکستہ ہوگیا۔حفاظت کے خیال سے میں شکستہ جہاز کے ایک تختہ پر سوار ہوگیا۔لیکن میرے دل نے کہا اگر اللہ نے تیرے حق میں ڈوب جانے ہی کا فیصلہ کردیا ہے تو لکڑی کا یہ تختہ تیرے کس کام آسکتا ہے۔چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا اور پانی پر آرہا اور بالآخر ساحل تک پہنچ گیا۔

توکل سے متعلق ایک دوسرا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر جب جنگلوں اور پہاڑوں میں ریاضت کررہے تھے تو ایک دن ان کو بہت پیاس معلوم ہوئی، ایک کنویں کے پاس پہنچے لیکن وہاں کوئی ڈول ڈوری نہ تھی، ناامید ہوکر کنویں کے پاس کھڑے ہوگئے، تھوڑی دیر میں دو جنگلی ہرن کنویں کے پاس آئے، کنویں کا پانی ابل کر کنارے تک آگیا، دونوں ہرنوں نے اپنی پیاس بجھائی۔شیخ فریدالدین بھی پانی پینا چاہتے تھے کہ پانی گہرائی میں اتر گیا۔انہوں نے متحیر ہوکر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا ''الٰہی ہرنوں کو تو تونے پانی پلایا اور اپنے بندے کو محروم کردیا''۔آواز آئی کہ تونے ڈول ڈوری پر اعتماد کیا اور ان جانوروں نے مجھ پر بھروسہ کیا، اس لیے تم محروم رہے اور یہ دونوں سیراب ہوئے''۔(۳۹)

نفی اسباب کے لیے یہ واقعہ جس طور گھڑا گیا ہے وہ محتاج تشریح نہیں۔تلاش رزق کی طرح علاج و معالجہ بھی صوفیہ کے نزدیک خلاف توکل ہے۔روایت ہے کہ ابو درداء سے ان کی بیماری کے ایام میں پوچھا گیا کہ آپ کو کیا شکایت ہے (ما تشتکی)؟ کہا: میرے گناہ (ذنوبی)۔عرض کیا گیا کہ آپ کی خواہش کیا ہے (ما تشتھی)؟ فرمایا: اپنے رب کی رحمت چاہتا ہوں، کہا گیا کہ آپ کے علاج کے لیے طبیب لایا جائے ، ارشاد ہوا : طبیب ہی نے تو مجھے بیمار کیا (الطبیب امر ضنی)۔(۴۰)

بیان کیا جاتا ہے کہ صلحاء کی ایک جماعت عیادت کی غرض سے ایک شیخ کے پاس گئی، ان میں سے کسی نے کہا: آپ کے لیے کوئی طبیب بلادیں؟ وہ خاموش رہے اور پھر فرمایا:

ان الطبيب بطبه و دوائه لا يستطيع دفع امر قدرًا

هلك المداوى والمداوى والذى جلب الدوا وباعه ومن اشترى (۴۱)

''بے شک طبیب اپنی طبی حذاقت اور عمدہ دواؤں کے باوجود امر مقدر یعنی موت کو دفع نہیں کر سکتا ہے۔

علاج کرنے والے اور علاج کرانے والے اور اس کے بائع وخریدار سب ہلاک ہوگئے''۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگیا کہ صوفیاء نے بعض مستثنیات سے قطع نظر، زہد وتوکل کے نام سے رہبانیت یعنی ترک دنیا کی تعلیم دی، جس سے اسلام کے تعبدی نظام کو سخت نقصان پہنچا۔ انہوں نے ریاضات اور مجاہدات کے نام سے ایسے بہت سے اعمال واوراد اختراع کیے جن کا اسلامی شریعت میں کوئی وجود نہیں، نہ عہد نبوت میں اور نہ ہی اس کے بعد کسی صحابیؓ نے اس طرح کے اعمال واوراد سے کبھی کوئی شغف رکھا۔ ان اصحاب رسول کے یہاں بھی ان چیزوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا جو زہد وعبادت میں درجہ کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔

یہ تعبدی اضافات محض اس لیے غلط نہیں ہیں کہ رسول اللہؐ نے ان کی تعلیم نہیں دی ہے اور صحابہؓ ان باتوں سے ناواقف تھے بلکہ اس وجہ سے بھی غلط ہیں کہ وہ غلو پر مبنی اور نفس کشی کے مترادف ہیں۔ انہوں نے کھلے طور پر قرآن اور نبیؐ کی تعلیمات سے انحراف کیا ہے اور اپنے اعمال سے آپؐ کے درج ذیل ارشاد کی تردید کی ہے:

لا تشددوا على انفسكم فشدد عليكم ،	اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ وہ تم پر سختی کرے۔
فان قوما شددوا على انفسهم فشدد	ایک قوم نے اپنے نفوس پر سختی کی تو اللہ نے ان
اللّٰه عليهم ، فتلك بقاياهم فى	پر سختی فرمائی۔ یہ صومعے اور خانقاہیں ان ہی کی
الصوامع والديار : رهبانية ابتدعوها	یادگار ہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی: رهبانية
ما كتبناها عليهم (۴۲)	ابتدعوها الخ۔

غلو فی العقیدہ: صوفیاء نے اتنا ہی نہیں کیا کہ اسلام میں رہبانیت کے تصور کو فروغ دیا جیسا کہ اوپر تفصیل سے ذکر ہوا، بلکہ اس کی بنیادی فکر توحید الوہیت کے مفہوم میں بھی حذف واضافہ کیا۔ یہ حذف واضافہ رہبانیت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ بنیاد کے مخدوش ہوجانے کے بعد عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

قرآن مجید میں توحید کا جو تصور پیش کیا گیا وہ یہ ہے کہ اللہ اپنی ذات و صفات اور اختیارات وقدرت میں واحد و یکتا ہے، کوئی اس کے برابر کا نہیں، وہ حسب ونسب سے پاک ہے اور وہی اپنے بندوں کا اکیلا حاجت روا اور مشکل کشا ہے۔ توحید کے اس تصور کو سورۂ اخلاص میں نہایت جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ فرمایا:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ

کہہ دو کہ وہ اللہ ایک ہے، اللہ بے احتیاج ہے (لیکن سب کی حاجتیں پوری کرتا ہے)، وہ سب کی چٹان (۴۳) (یعنی پشتیبان) ہے، نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ وہ خود کسی کی اولاد ہے (یعنی حسب و نسب سے پاک ہے) اور کوئی اس کا ہم پلہ نہیں (یعنی کوئی نہیں جو کسی اعتبار سے اس کا مثیل ونظیر ہو)۔

اس کے علاوہ اللہ اس کائنات کا خالق و مالک ہی نہیں، اس کا نظم وانصرام بھی تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے، اس کارِ جہاں بانی میں کوئی مخلوق ادنی شرکت بھی نہیں رکھتی۔ فرمایا ہے:

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِىٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا (سورہ بنی اسرائیل:۱۱۱)

اور کہہ دو کہ تعریف کا سزاوار بس اللہ ہی ہے، جو کوئی اولاد نہیں رکھتا اور نہ کوئی سلطنت میں اس کا شریک ہے اور نہ ہی ناتوانی کے سبب کوئی (نظام عالم کے چلانے میں) اس کا مددگار ہے اور اس کی خوب بڑائی بیان کرو۔

یہودیوں اور عیسائیوں دونوں میں یہ خیال عام تھا کہ ان کی قوم کے اولیاء صاحب اختیار ہیں اور لوگوں کو نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اس خیال کے تحت وہ ان سے غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے اور مصیبتوں اور حاجتوں میں انہیں مدد کے لیے پکارتے تھے جیسا کہ آج کل بہت سے مسلمان بزرگان دین کے مقابر پر جا کر ان سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس خیال کی تردید میں فرمایا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کو اللہ کا ہم سر

اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا

(سورہ بقرہ:۱۶۵)

ٹھہراتے ہیں اور ان سے اس طرح محبت رکھتے ہیں جس طرح خدا سے محبت رکھنی چاہیے ۔ جو لوگ (فی الواقع) ایمان والے ہیں وہ سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں اور اگر یہ ظالم (یعنی شرک کرنے والے) اس وقت کو دیکھ سکتے جب کہ وہ خدا کے عذاب کا سامنا کریں گے (تو انہیں معلوم ہو جاتا) کہ ساری قوت اللہ ہی کے ہاتھ میں (اس کے سوا سب بے اختیار ہیں)''۔

یہ ہے قرآن کا تصور توحید جس میں ایک اللہ کے سوا ہر وجود کے اختیار وقدرت کی نفی کی گئی ہے۔لیکن صوفیاء کے نزدیک یہ توحید کا ابتدائی درجہ ہے اور عام لوگوں کے لیے ہے(۴۴)، خواص کی توحید کا تعلق حقائق کے اثبات سے اور اخص الخواص کی توحید خدا کی ذات کے ساتھ ان کا قیام ہے(۴۵)۔شاہ ولی اللہ دہلویؒ توحید ذاتی کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خدائے تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لیے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ وہ اپنی ''انا'' میں جو عبارت ہے ان کی ''ہویت'' سے، توحید صفاتی کا جلوہ دیکھیں یعنی ان کے لیے یہ انا ''آئینہ'' بنتا ہے اس اصل وجود کا جس نے مختلف مظاہر کائنات میں ظہور فرمایا ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جب سالک اپنی ''انا'' پر نظر کرتا ہے تو اس کی نظر اپنی ''انا'' تک رک نہیں جاتی بلکہ وہ اس ''انا'' کے واسطے سے اصل وجود تک جو سب ''اناؤں'' کا مبدأ اول ہے پہنچ جاتی ہے اور جب سالک اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس کی نظر میں صرف اصل وجود ہی رہ جاتا ہے اور یہ تمام کے تمام مظاہر واشکال بیچ سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ توحید ذاتی کا مقام ہے''۔(۴۶)

اور توحید صفاتی کے مفہوم کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

''توحید صفاتی سے مراد یہ ہے کہ سالک مختلف صورتوں اور مظاہر میں

صرف ایک اصل کو جلوہ گر دیکھے اور بغیر کسی شک وشبہ کے اس بات کو بداہتہً مان
لے کہ سارے کے سارے اختلافات ایک ہی اصل میں ثابت اور موجود ہیں اور
پھر وہ اس اصل کو نوع بہ نوع صورتوں میں جلوہ گر بھی دیکھے اور ہر جگہ اس اصل کو
پہچانے۔اس کی مثال یوں سمجھیے کہ کوئی شخص نوع انسانی کے تمام افراد میں ایک
انسان کلی کا مشاہدہ کرتا ہے یا وہ موم کی مختلف مورتوں میں ایک ہی موم کی جنس کو
ہر مورت میں موجود پاتا ہے۔الغرض ایک اصل ہے جو وجود کے ہر مظہر میں اور
کائنات کی ہر شکل میں مشترک ہے، سالک کو چاہیے کہ وہ اس اصل کو ہر چیز میں
بے رنگ دیکھے اور کسی مظہر کے مخصوص رنگ کو اس میں موثر نہ مانے''۔(۴۷)

شاہ صاحب نے توحید ذاتی اور توحید صفاتی کا جو مفہوم بیان کیا ہے وہ ایک مابعد الطبیعیاتی تصور ہے۔کوئی بھی عالم جس نے قرآن کا سچائی کی خاطر مطالعہ کیا ہے یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ توحید ذات وصفات کا یہی تصور قرآن مجید میں پیش کیا گیا ہے۔قرآن مجید میں ہر جگہ کسی استثناء کے بغیر توحید ذات سے مراد کائناتی اقتدار کی وحدت کا اثبات ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا وجود اس کائنات میں بالذات قوت واقتدار کا مالک نہیں ہے اور توحید صفات سے مراد اسی علی الاطلاق اقتدار کے گوناگوں مظاہر ہیں، مثلاً اس کے علم وخبر کی ہمہ گیری، اس کی رحمت وشفقت کی بے پایانی اور اس کے عدل بے لاگ کی کارفرمائی وغیرہ۔

شاہ صاحب نے جس مقام سلوک کو توحید ذاتی کہا ہے وہ صوفیاء کے نزدیک توحید کا سب سے اونچا اور آخری درجہ ہے اور تصوف کی اصطلاح میں اس کو فنا فی التوحید کہتے ہیں۔امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

''عالم موجودات میں صرف ایک کو دیکھے اور یہی صدیقین کا مشاہدہ
ہے۔اس حالت کو صوفیہ فنا فی التوحید کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ صرف ایک کو دیکھتا
ہے یہاں تک کہ خود کو بھی نہیں دیکھتا (لا یری الا واحدا فلا یری نفسه
ایضا)''۔(۴۸)

جو صوفیاء توحید کے اس آخری درجے تک پہنچ جاتے ہیں ان کی جلالت شان نہ پوچھیے،

خدا کے رسول بھی ان کے سامنے فروتر نظر آتے ہیں۔ نبیؐ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ

(سورہ اعراف:۱۸۸)

کہہ دو (اے محمد) میں خود اپنی ذات کے لیے کسی نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھتا (چہ جائیکہ دوسروں کو نفع اور نقصان پہنچا سکوں)، مگر جو اللہ چاہے (یعنی مجھے وہی نفع اور نقصان پہنچ سکتا ہے جو اللہ نے میرے لیے لکھ دیا ہے)، اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو بہت سا نفع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان لائیں''۔

مگر صوفیاء اس پائے کے عالم الغیب تھے کہ سارا عالم موجودات ان کی نظروں کے سامنے مثل آئینہ کے روشن تھا۔ ہر چیز کو وہ بچشم سر دیکھتے تھے، خواہ وہ تحت الثری میں ہو، ہر بات سے وہ باخبر تھے خواہ وہ ستر پردوں میں رہ کر کی گئی ہو، اتنا ہی نہیں ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ کون بشر جنتی ہے اور کون دوزخی۔ شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں:

''ان اہل تصوف کے علم کی شان ومنزلت یہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی کسی شخص کے قدموں کا نشان بھی دیکھ لے تو جان لیتا ہے کہ یہ نقش قدم سعید یعنی کسی جنتی کا ہے یا شقی یعنی کسی جہنمی کا''۔(۴۹)

عبدالکریم جیلی لکھتے ہیں:

''ان میں سے ہر ایک پرندوں کی بولیوں کے علاوہ زمین اور آسمان میں جو بھی حرکت ہوتی ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ شبلیؒ نے کہا ہے، اگر اندھیری رات میں کوئی کالی چیونٹی کسی پتھر پر چلتی اور میں اس کے چلنے کی آواز نہ سنتا تو میں ضرور کہتا، مجھے دھوکا دیا گیا ہے، یا میں کسی فریب کا شکار ہو گیا ہوں''۔(۵۰)

گویا وہ علم کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہم سر تھے (نعوذ باللہ)، کیونکہ یہ شام علم تو اللہ ہی

کے لیے مخصوص ہے۔ فرمایا ہے:

وَعِنۡدَهٗ مَفَاتِيۡحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَآ اِلَّا هُوَ وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ (سورہ انعام:۵۹)

غیب (کے خزانے) کی کنجیاں اس کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، وہ بحر و بر کی ساری چیزوں سے واقف ہے، (درخت سے) جو پتہ بھی گرتا ہے اس کو وہ جانتا ہے، زمین کے اندھیروں میں پڑے ہوئے دانے کی بھی خبر رکھتا ہے اور (کائنات کی) ہر خشک و تر چیز ایک کھلی کتاب (یعنی لوح محفوظ) میں لکھی ہوئی ہے۔

اب ذرا اس جماعت کے ان افراد کی طاقت و قوت اور تصرف کا حال بھی دیکھ لیں جن کو ان کی اصطلاح میں اقطاب و اوتاد (۵۱) کہا جاتا ہے۔ شیخ عبدالکریم جیلی نے لکھا ہے کہ اقطاب کو سلطنت موجودات پر مکمل تصرف حاصل ہوتا ہے (۵۲)۔ شیخ محی الدین ابن عربی لکھتے ہیں:

> ''ان اوتاد میں سے ایک کے ذریعہ اللہ مشرق کی حفاظت کرتا ہے اور یہی اس کی ریاست ہے، بقیہ تین اوتاد مغرب، جنوب اور شمال کی حفاظت کرتے ہیں اور یہ تقسیم سمت کعبہ کے لحاظ سے ہے۔ یہی لوگ ہیں جو اللہ کے اس قول: الم نجعل الارض مھٰدا والجبال اوتادا کی بنا پر پہاڑ سے تعبیر کیے جاتے ہیں اس لیے کہ ان ہی پہاڑوں کی وجہ سے زمین اپنی جگہ پر رکی ہوئی ہے۔ ان لوگوں (یعنی اوتاد) کا معاملہ اس دنیا میں زمین کے پہاڑوں کی طرح ہے (یعنی ان ہی کی وجہ سے یہ عالم اپنی جگہ پر قائم ہے)''۔ (۵۳)

اس اقتباس کو سامنے رکھیں اور سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیات کو پڑھیں جو اس سے پہلے نقل کی جا چکی ہیں، جن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ ''اللہ کی سلطنت میں اس کوئی شریک نہیں ہے اور نہ یہ بات ہے کہ وہ تنہا اپنی سلطنت کا انتظام کرنے سے قاصر ہے اس لیے کچھ لوگ اس کے مددگار رہیں'' اور پھر خود فیصلہ کریں کہ اقطاب و اوتاد کے ذریعہ سے انتظام عالم کی بات اسلام کے تصور توحید کے منافی ہے یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کھلا ہوا کفر و شرک ہے۔

صوفیاء کی جماعت نے عقیدۂ توحید ہی کے ساتھ کھلواڑ نہیں کیا بلکہ عقیدۂ رسالت بھی ان کے دست تحریف سے محفوظ نہیں ہے۔ عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب ''الانسان الکامل'' میں جس کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے، لکھا ہے کہ نبیؐ ہر دور میں مختلف صوفیاء کے قالب میں ظہور کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے شیخ شرف الدین اسماعیل جبرتی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ نبیؐ بھی تھے اور میرے شیخ بھی (وکنت اعلم انه النبیؐ وکنت اعلم انه الشیخ)۔(۵۴)

آگے اس سے بڑا کفر ملاحظہ فرمائیں۔ شیخ محی الدین ابن عربی قرآن کی آیت ''وما رمیت اذ رمیت ولکن الله رمٰی (انفال:۱۷) کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''اے محمد جب تم نے بظاہر پھینکا تو حقیقت میں نہیں پھینکا بلکہ اللہ ہی نے پھینکا''۔ آنکھوں نے تو صورت محمدی کو دیکھا جس کے لیے حس ظاہری میں رمی یعنی پھینکا ثابت ہے۔ اسی صورت سے اللہ تعالیٰ نے نفی رمی بھی کی ہے، یعنی حضرت نے بالذات نہیں پھینکا (وما رمیت)، پھر اسی صورت محمدی کے لیے رمی ثابت کی گئی باعتبار توسط اور واسطہ ہونے کے (اذ رمیت)، پھر بالذات پھینکنے والے کو صاف طور پر بیان کیا کہ وہ اللہ ہے (ولکن الله رمی) لیکن صورت محمدی میں''۔(۵۵)

گویا صورت محمدی میں کنکریاں پھینکنے والا اللہ تھا، کوئی دوسرا نہیں (نعوذ باللہ)۔ کیا یہ کھلا ہوا کفر وشرک نہیں ہے؟ اور اگر یہ کفر وشرک نہیں ہے تو پھر ماننا ہوگا کہ دنیا میں کسی نے کبھی کفر و شرک نہیں کیا ہے۔

ہندوستان کے ایک عظیم المرتبت عالم اور اسرار تصوف کے محرم ونکتہ داں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''فیوض الحرمین'' میں لکھا ہے کہ رسول اللہؐ اللہ تعالیٰ ''تدلی'' کا مظہر بشری میں ظہور تھے اور اس اعتبار سے ظاہر اور مظہر میں کوئی فرق نہ تھا۔ شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ رسول اللہؐ انسانوں کے حاجت روا ہیں (۵۶) اور وہ خود بھی آپؐ سے استمداد کرتے تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے بیان کے مطابق رسول اللہؐ ہی نے ان کو مجددیت، وصایت اور قطبیت ارشادیہ کے مناصب سے نوازا تھا۔(۵۷)

وہ قائم بالزمان بھی تھے بلکہ ان کا مقام کچھ اس سے زیادہ تھا۔ بارہویں مشاہدہ کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں ''علاوہ ازیں ایک دن مجھ پر ذات حق کی نظر کا فیضان ہوا اور یہ وہ چیز ہے جو انبیاء میں سے صرف ہمارے نبی کو نصیب ہوئی ہے''۔ (۵۸)

قارئین نے دیکھ لیا کہ صوفیاء نے تصوف کے پردے میں کس بے خوفی کے ساتھ کھلم کھلا کفر و شرک کی باتیں کی ہیں، پھر بھی ہمارے صوفی علماء کہتے ہیں کہ تصوف عین اسلام ہے۔ یہ تصوف ہی ہے جو شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے نابغہ روزگار عالم دین کو غلط راہ میں لے گیا اور ان کے قلم سے وہ باتیں نکلیں کہ یقین ہی نہیں آتا کہ یہ ان کی تحریر ہے۔ بادۂ تصوف پی کر بڑے بڑوں کا وہی حال ہوا ہے جو ''بنت عنب'' کے عشق میں مخمور لوگوں کا دیکھا جاتا ہے۔ (۵۹) (باقی)

حواشی

(۱) کشف المحجوب، مطبوعہ لاہور، ۱۹۲۳ء، ص ۲۳۔ (۲) یہ صفا سے مشتق نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ اس سے اسم نسبت صفوی ہوگا نہ کہ صوفی۔ (۳) کشف المحجوب، ص ۲۳۔ (۴) ابن خلدون، مقدمہ، ص ۴۶۷۔ (۵) علامہ ابن تیمیہ، الصوفیاء والفقراء، بحوالہ تاریخ تصوف در اسلام، ڈاکٹر قاسم غنی، مطبوعہ طہران، ۱۳۲۲ھ، ص ۴۴۔ (۶) تاریخ تصوف در اسلام، ص ۴۵۔ (۷) کشف المحجوب، ص ۳۲۔ (۸) شیخ فریدالدین عطار، تذکرۃ الاولیاء، بمبئی، ۱۳۲۵ھ، ص ۸۵۔ (۹) ایضاً، ص ۱۶۹۔ (۱۰) ایضاً۔ (۱۱) ایضاً، ص ۲۵۸۔ (۱۲) تذکرۃ الاولیاء، ص ۲۵۹۔ (۱۳) ایضاً۔ (۱۴) ایضاً، ص ۲۳۹۔ (۱۵) ایضاً، ص ۳۸۶، تفصیل کے لیے دیکھیں راقم کی کتاب ''وحدت الوجود، ایک غیر اسلامی نظریہ''۔ (۱۶) تذکرۃ الاولیاء، ص ۳۸۶۔ (۱۷) ہمعات، ترجمہ: تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ تاریخ، پروفیسر محمد سرور، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور، ۱۹۴۶ء، ص ۴۵ تا ۵۰۔ (۱۸) ایضاً۔ (۱۹) صحیح مسلم۔ (۲۰) بخاری و مسلم۔ (۲۱) دیکھیں، ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء، شاہ ولی اللہ دہلویؒ (مقصد اول)۔ (۲۲) ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی۔ (۲۳) شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ازالۃ الخفاء میں امت مسلمہ کے اندر پیدا ہونے والے جن تیس فتنوں کا ذکر کیا ہے ان میں یہ چیزیں بھی شامل ہیں۔ (۲۴) حیرت و افسوس کی بات ہے کہ ہمارے بعض صوفی علماء اس بدعت کو جائز سمجھتے ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

''غرض جتنے اشغال ہیں وہ جمع خاطر کے لیے ہیں، مقصود بالذات نہیں اور اس میں مشائخ نے یہاں تک وسعت کی ہے کہ بعض اشغال جوگیوں تک سے لیے ہیں، مثلاً حبس دم جوگیوں کے ہاں کا شغل ہے مگر چونکہ یہ ان کا قومی اور مذہبی شعار نہیں اور خطرات کے دفع کے لیے نافع ہے، اس لیے اس کو اپنے ہاں لے لیا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں''۔ (دیکھیں تجدید تصوف وسلوک، مولانا عبدالباری ندوی، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۹ء، ص ۳۹، ۴۰)

(۲۵) مسند ابن حنبل، ج ۵، ص ۲۶۶۔ (۲۶) صحیح بخاری، کتاب النکاح۔ (۲۷) کشف المحجوب، شیخ ابوالحسن علی ہجویریؒ، ص ۲۹۲۔ (۲۸) احیاء علوم الدین، امام ابومحمد غزالیؒ، ج ۴، ص ۳۴۹۔ (۲۹) سیر الاولیاء، میر خورد دہلویؒ، مطبوعہ دہلی، ۱۳۰۲ھ، ص ۴۰۔ (۳۰) تجدید تصوف وسلوک، ص ۴۶۳، ۴۶۴۔ (۳۱) تلبیس ابلیس، قاہرہ، ۱۳۶۹ھ، ص ۱۵۱۔ (۳۲) ایضاً، ص ۲۰۹۔ (۳۳) امام ابوالقاسم قشیری، الرسالۃ القشیریۃ، مصر، ۱۳۰۴ھ، ص ۱۰۱۔ (۳۴) المرشد الامین، خلاصہ احیاء العلوم، امام غزالی، نئی دہلی، ۱۹۸۸، ص ۲۴۸، ۲۴۹۔ (۳۵) منہاج العابدین، طبع مصر، ۱۳۱۷ھ، ص ۵۵۔ (۳۶) شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے جلیل القدر خلیفہ تھے۔ (۳۷) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ، اخبار الاخیار (اردو ترجمہ مولانا اقبال الدین احمد)، دارالاشاعت کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۲۶۳۔ (۳۸) تلبیس ابلیس، ص ۲۷۸۔ (۳۹) خزینۃ الاصفیاء، ج ۱، ص ۲۹۳، بحوالہ بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مطبع معارف اعظم گڈھ، ۱۹۴۹ء، ص ۱۲۱۔ (۴۰) الدکتور سلمان قطاء لسیہ، مخطوطات الطب والصیدلۃ، فی المکتبات بحلب، طبع اول، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۶ء، ص ۲۰۵۔ (۴۱) مخطوطات الطب والصیدلۃ، ص ۲۰۶۔ (۴۲) سنن ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الحد۔ (۴۳) حمد کے ایک معنی چٹان کے بھی ہیں۔ دشمن کے ضرر سے بچنے کے لیے اس کی پناہ لی جاتی ہے، گویا وہ دشمن کے مقابلے میں پناہ دہندہ ہے۔ (۴۴) اس سے اصحاب رسول کی تحقیر ہوتی ہے۔ (۴۵) دیکھیں، عبداللہ انصاری ہروی کی ''منازل السائرین''۔ (۴۶) ہمعات (تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ)، ص ۵۰، ۵۱۔ (۴۷) ایضاً۔ (۴۸) احیاء علوم الدین، ج ۴، ص ۲۱۲۔ (۴۹) فتوحات مکیہ، شیخ محی الدین ابن عربی، طبع بیروت، ج ۳، ص ۱۳۔ (۵۰) الانسان الکامل، طبع مصر، ورقہ ۱۳۶۔ (۵۱) صوفیہ کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے اس دنیا کا نظم وانصرام کرنے کے لیے اس کے کچھ خاص بندے مامور ہیں۔ اس جماعت کے سردار کو قطب کہتے ہیں۔ قطب کے بعد اوتاد کا درجہ ہے۔ (۵۲) الانسان الکامل، ورقہ ۱۳۶۔ (۵۳) فتوحات مکیہ، ج ۳، ص ۱۲۔ (۵۴) الانسان الکامل، ورقہ ۱۴۶۔

(۵۵) فصوص الحکم، شیخ محی الدین ابن عربی، اردو ترجمہ: محمد عبدالقدیر صدیقی، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۲ء، ص ۳۶۹۔
(۵۶) حالانکہ نبیؐ نے فرمایا ہے:

قُلْ لَا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا کہہ دو (اے محمدؐ) میں خود اپنے نقصان اور نفع کا اختیار نہیں رکھتا۔ (سورہ یونس: ۴۹)

(۵۷) فیوض الحرمین، طبع دہلی، دیکھیں مشاہدہ نمبر ۱۰، ۳۶، ۴۴۔ (۵۸) ایضاً، دیکھیں مشاہدہ نمبر ۴۴، ۱۲۔
(۵۹) مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب ''تجدید احیائے دین'' میں تصوف کو ''چنیا بیگم'' لکھا تو نام نہاد صوفیاء کے ساتھ صوفی علماء نے بھی کافی واویلا مچایا لیکن سچ بات کا انکار وہی لوگ کر سکتے ہیں جو قرآن کے علاوہ کسی اور چیز کو حق وصداقت کا پیمانہ قرار دیتے ہیں۔

بابو کنج لال دلوالی
ایک منفرد ہندو سیرت نگار

حافظ محمد نعیم

سیرت نبوی ﷺ پر غیر مسلم حضرات کی مثبت انداز میں لکھی گئی جو تحریریں ہمارے سامنے موجود ہیں ان میں کچھ تو ایسی ہیں جو سوانحی انداز میں بعض مسلمان سیرت نگاروں کی پیروی کرتے ہوئے لکھی گئی ہیں۔ لیکن بعض تحریریں ایسی ہیں کہ ان میں بیان کردہ معلومات اور اخذ کردہ نتائج مصنف کے دقیق مطالعے اور فہم و فراست کا پتہ دیتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی سیرت پر مثبت انداز میں لکھنے کا شرف مستشرقین کے ساتھ ساتھ بعض ہندو اور سکھ حضرات کو بھی حاصل ہوا۔ ان حضرات نے نظم و نثر ہر دو اصناف میں حضور ﷺ کی بارگاہ میں گلہائے عقیدت پیش کیے۔ انہی لوگوں میں سے ایک نام بابو کنج لال دلوالی کا ہے جن کی کتاب ''حضرت محمدؐ اور اسلام'' ہندوؤں کے قلم سے لکھی گئی کتب سیرت میں اپنے اسلوب اور استدلال کے حوالے سے ممتاز حیثیت کی حامل ہے اور اپنے لکھنے والے کی فہم و فراست اور انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

بابو کنج لال دلوالی ایم اے۔ پلول نزد دہلی کے رہنے والے تھے☆۔ ڈاکٹر انور محمود خالد نے اپنی کتاب ''اردو نثر میں سیرت رسولؐ'' میں اس کتاب کا حوالہ دیا ہے(۱)۔ ممتاز لیاقت نے بھی اپنے ایک مضمون میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے (۲) لیکن دونوں حضرات نے کتاب کے نام اور مصنف کے نام کے علاوہ اور معلومات فراہم نہیں کیں۔ یہ کتاب چونکہ ہندوؤں/سکھوں کی دیگر کتب سیرت سے اپنے اسلوب، انداز، منطقی دلائل اور اخذ نتائج کے حوالے سے مختلف ہے اس

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ عربی و علوم اسلامیہ، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

لیے مناسب خیال کیا گیا کہ اس کتاب کو سامنے لایا جائے اور اس کتاب کے حوالے سے مصنف کی انفرادیت اور اسلوب کا جائزہ لیا جائے۔

''حضرت محمدؐ اور اسلام'' اصل میں بابو گنج لال دلوالی کی ایک تقریر تھی جو انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل سوسائٹی کی طرف سے آنحضرت ﷺ کے روزِ ولادت کی مقدس تقریب پر بمقام کولہاپور بروز سعید ۱۲ ربیع الاول ۱۳۴۸ھ (۱۸ اگست ۱۹۲۹) کو بحیثیت صدر جلسہ کی تھی بعدازاں اس تقریر کو انہوں نے ترمیم واضافہ کے ساتھ کتابی شکل میں جید برقی پریس بلیماراں دہلی سے افادۂ عام کے لیے شائع کروایا۔ کتاب ضخامت میں قلیل (۵۹ صفحات) ہونے کے باوجود اپنی اہمیت، خاصیت اور اسلوب کے حوالے سے منفرد ہے اور ہندوؤں رسکھوں کی کتب سیرت میں نمایاں ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بڑا اہم ہے کہ برصغیر میں انگریز نے اپنے تسلط کو قائم کرنے اور ذاتی مفادات کی پرورش کرنے کے لیے ہندو مسلم فسادات کو ہوا دی۔ مذہب کے نام پر برصغیر میں نفرت کی ایسی آگ بھڑکی جس نے تمام ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک دوسرے کے مذہبی شعائر اور مذہبی شخصیات کو تنقید کا نشانہ بنانا معمول بن گیا۔ ان حالات کے پیش نظر دونوں اطراف سے اہل علم حلقوں نے رواداری اور برداشت کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس مقصد کے لیے مذہبی وثقافتی اجتماعات میں ایک دوسرے کے مشاہیر اور مذہبی شخصیات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا جذبہ فروغ پانے لگا (۳)۔ چونکہ اس دور میں دیانند کی آریہ سماجی تحریک اسلام اور اسلامی روح کے منافی کام کر رہی تھی اور پیغمبر اسلام کو ہدف تنقید بنا رہی تھی (۴)۔ اس لیے مسلمانوں نے ہندوستان کے طول وعرض میں ''تحریک یوم میلاد النبیؐ'' کے انعقاد کا آغاز کیا جس میں مسلمان علماء کے ساتھ ساتھ ہندو اور سکھ مشاہیر کو بھی دعوت دی جاتی تاکہ اپنے قائدین کی پیروی کرنے کے باوجود ان کے دلوں سے اسلام کے خلاف بغض وعداوت اور نفرت کم ہو (۵)۔ علامہ اقبال نے بھی ۱۹۲۹ء میں مسلمانوں کے نام اپنے ایک پیغام میں کہا کہ اتحاد، اسلام کی تقویت، مذہب کا صحیح احترام قائم کرنے اور ملک میں بانیان مذاہب کا صحیح احترام قائم کرنے کے لیے ۱۲ ربیع الاول کو ہندوستان کے گوشے گوشے میں بڑے تبلیغی جلسوں اور مظاہروں کا انعقاد کیا

جائے (۶)۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن اسلامیہ پٹنہ، جماعت احمدیہ قادیان، انجمن حمایت اسلام اور اجلاس ندوۃ العلماء کو پلیٹ فارم بنایا گیا (۷)۔ نیز اس مقصد کے حصول کے لیے سیرت کمیٹی کا وجود بھی عمل میں آیا (۸)۔ ۱۷/جون ۱۹۲۸ء، ۱۸/اگست ۱۹۲۹ء اور ۲۴/جون ۱۹۳۴ء کے ۱۲/ربیع الاول کے اجتماعات بڑے اہم ہیں جن میں ہندوؤں/سکھوں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی اور پیغمبرؐ اسلام کی سیرت پر تقاریر کیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ بابو کنج لال کی تقریر بھی ۱۸/اگست ۱۹۲۹ء کے ۱۲/ربیع الاول کے موقع پر کی گئی تھی اور بعد ازاں کتابی شکل میں شائع ہوئی۔

تعارف کتاب: حضرت محمدؐ اور اسلام روایتی سوانحی انداز میں نہیں لکھی گئی۔ مصنف نے محض واقعات بیان کرنے کی بجائے ان اصلاحات اور احسانات سے بحث کی ہے جو آپ ﷺ نے عالم انسانیت پر فرمائے۔

ہندو ذہنیت پر اظہار افسوس: کتاب کے آغاز میں بابو کنج لال نے ہندوؤں کے عمومی رویے سے بحث کی ہے کہ جب اور جہاں بھی آپؐ کے احسانات اور اخلاق حسنہ کا ذکر ہوتا ہے ہندو بھائی عموماً ایک حجاب اور ہزیمت محسوس کرتے ہیں اس رویے کو انہوں نے نہایت غلط طرز استدلال قرار دیا ہے اور اظہار افسوس کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ تمام عالی دماغ اور روشن ضمیر اصحاب قابل تعظیم اور باعث افتخار ہیں اس لیے آنحضرتؐ کی نعت وستائش سے شرمندگی محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ اور آپ ﷺ کی ذات اقدس پر مذہبی نقطۂ خیال سے نہ سہی عقلی اور اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ہی فخر کرنا چاہیے۔ (۹)

ابتدائی جملوں کے بعد مصنف نے آپ ﷺ کی پیدائش کے زمانہ، ملک، شہر، خاندان اور گردوپیش کے حالات کو عجیب خصوصیات کا حامل قرار دیا ہے اور ایسے حالات میں آپ ﷺ کی پیدائش کی حقیقی ضرورت کو ثابت کیا ہے مصنف نے مختلف تہذیبوں (چینی تہذیب، ایرانی تہذیب، یونانی تہذیب، مصری تہذیب، ہندوستان کی تہذیب، یورپین تہذیب) اور ان کے زوال سے بحث کی ہے مصنف کے مطابق بہ لحاظ تہذیب آپ ﷺ کی پیدائش کے وقت کل روئے زمین پر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا کوئی ملک اور تہذیب فروغ پر نہ تھی (۱۰)۔ عربوں کی

اخلاقی حالت، سماجی حالت، خانہ کعبہ کی تاریخ، آپ ﷺ کی پیدائش، اوائل عمر، آپ ﷺ کی تبلیغ، قریش کی طرف سے آپ ﷺ کو دی گئی تکالیف، آپ ﷺ کا فتح یاب ہونا اور رحلت وغیرہ کا بیان انتہائی اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کی معاشرتی اصلاحات کے متعلق مصنف کا نقطہ نظر: حالات زندگی کے مختصر بیان کے بعد عالم انسانیت پر آپ ﷺ کے تہذیبی اور اخلاقی احسانات کا تذکرہ ہے جس کو نمبروار درج کیا گیا ہے عربوں میں تہذیب وتمدن کا پیدا ہونا، اتحاد واتفاق سے رہنا، اخوت اور بھائی چارے کا مظاہرہ، قمار بازی اور شراب کا خاتمہ، غلاموں اور کنیزوں کے حقوق کے تحفظ وغیرہ کو آپ ﷺ کی عظیم اصلاحات قرار دیا ہے۔ عربوں کے معاشرے میں عورت کی حیثیت اور اس کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کو مصنف بطور خاص بیان کرتا ہے اور عورتوں کے حق میں آپ ﷺ کی اصلاحات کو عظیم الشان کارنامہ قرار دیتا ہے۔ عورت کے بیوی کی حیثیت سے حقوق، دختر کشی کی ممانعت، وراثت میں حصہ، ان کے ساتھ نیک سلوک کی تلقین اور معاشرے میں عورت کو مساوی مقام دینے کو مصنف آپ ﷺ کی طرف سے تہذیب عالم پر ایک عظیم احسان گردانتا ہے۔

بابو گنج لال دلوالی لکھتے ہیں:

> ''روئے زمین کے مہذب تر اور سرسبز وشاداب تر ملکوں میں بھی اس وقت تک کسی دانش مند کی توجہ عورتوں کی مظلومانہ اور غلامانہ حالت کی اصلاح کی طرف مبذول نہیں ہوئی تھی ان بیچاریوں کی حالت زار پر سب سے پہلے اس خداترس نے ترس کھایا اور کل عرب کی عورتوں کو بھیڑ اور اونٹنیوں کی حیثیت سے اٹھا کر انسانوں کی ذیل میں اس نے شامل کر کے دکھایا ہے۔ غور کیجیے تہذیب عالم پر یہ کتنا بھاری احسان فرمایا ہے''۔(۱۱)

مصنف کے مطابق مندرجہ بالا اصلاحات کے لیے اخلاقی فضا اس زمانے میں موجود نہیں تھی لیکن آج تیار شدہ ہے جو اصلاحات آپ ﷺ نے اس زمانے میں فرمائیں آج مسلم و غیر مسلم تمام صحیح الدماغ لوگ ان اصلاحات کو مانتے ہیں۔ ان اصلاحات کے بعد مصنف نے کچھ

ایسی برائیوں کا ذکر کیا ہے جن کو لوگوں نے آج تک نہیں سمجھا کہ یہ چیزیں ان کے لیے مضر ہیں مگر آنحضرتؐ نے اس زمانے میں ان چیزوں کو نقصان دہ اور زہر آلود بتایا تھا لیکن لوگ آج تک نہیں سمجھے کہ وہ زہر آلود ہیں لیکن جلد یا بدیر ایک زمانہ آئے گا جب اس جہاں پرش (نبی کریمؐ) کی رائے کو درست تسلیم کیا جائے گا۔ان چیزوں میں

۱- اہل عالم کا دنیا اور دولت دنیا کو اہمیت دینا۔

۲- لباس، فیشن اور خوراک میں اسراف۔

۳- شریف بہو بیٹیوں کا مردوں کے مجمع میں آنا جانا۔

۴- مادر پدر آزادی کا تصور وغیرہ شامل ہیں۔

مصنف کے مطابق آپ ﷺ کی اصلاحات کی ضرورت صرف عرب کو ہی نہیں تھی بلکہ کل روئے زمین کو تھی اور پھر آپ ﷺ کی اصلاحات کے اثرات صرف عرب تک محدود نہیں رہے بلکہ کل عالم ان سے مستفید ہوا ہے۔ یورپ اور امریکہ آج جن اصلاحات کے دعوے دار ہیں ان اصلاحات کی بنیاد آپ ﷺ نے ڈالی تھی۔

اخلاق حسنہ کے چند نمونے: آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ کے چند نمونے بیان کیے گئے ہیں مثلاً آپ ﷺ کی پاکیزہ زندگی، سادگی، کفایت شعاری، منصف مزاجی، محنت کو عار نہ سمجھنا، جھاڑ وخود دینا، خندق کھودنا، تعمیر مسجد میں حصہ لینا، رواداری، وسعت اخلاق، غیر مسلموں کو اپنی مسجد میں ٹھہرانا، نفاست طبع، چال چلن کی پاکیزگی، صفائی کا خیال، معاشرے کے دیگر افراد کے حقوق کا خیال، جانوروں پر رحم، ہمسایوں کے حقوق، کمزوروں کے حقوق کا تحفظ اور عفوو درگزر کو اخلاق حسنہ کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے۔

اعتراضات کے جوابات: مصنف اسلامی افکار، تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی طرف سے کی گئی اصلاحات کا معترف نظر آتا ہے۔اسلام اور پیغمبرؐ اسلام پر روایتی اعتراضات مثلاً تعدد ازواج، اسلام کا تلوار کے زور سے پھیلنا، آپؐ کی علمی تحقیر، مسلمانوں کا ہندو دھرم کو بگاڑنا اور آنحضرت ﷺ کے اعلیٰ کردار کے خلاف فضول باتوں کا مصنف نے نہ صرف بھرپور انداز میں جواب دیا ہے بلکہ یہ اعتراضات کرنے والوں کی عقل پر ماتم بھی کیا ہے اور ان کو لغو اور من گھڑت قرار

دیا ہے۔(۱۲)

اسلام کے بزورشمشیر پھیلانے کے اعتراض کے متعلق مصنف لکھتا ہے کہ ''مسلمانوں کو مجبوراً اپنے دفاع میں تلوار اٹھانا پڑی۔مسلمانوں نے ہر طرح کے ظلم وستم برداشت کیے وطن اور گھر بار چھوڑا اس پر بھی دشمنوں نے بس نہ کی اور افواج بنا کر ان پر مدینہ میں بھی چڑھ گئے تو مجبوری کو تلوار سنبھالی''۔(۱۳)

مصنف کے انداز میں منطقی دلائل اور عقلی استدلال کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔اس بات کا ثبوت اس وقت ملتا ہے جب مصنف غزوات نبویؐ کا دفاع کرتے ہوئے مقامات غزوات کے تعین کے ذریعے معترضین کے اعتراض کو رد کرتا ہے۔

مصنف لکھتا ہے:

> ''مقامات جنگ ہی اس کا حال بتا رہے ہیں اگر شروع کی جنگیں مکہ کے گردونواح میں ہوئیں تو مدینہ والے چڑھ کر آئے ہوں گے اور اگر مدینہ کے گردونواح میں ہوئیں تو اہل مکہ چڑھ کر گئے ہوں گے پس ملاحظہ فرمالیجیے کہ شروع کی تمام جنگیں مکہ والوں سے نواح مدینہ میں ہوئی ہیں پھر فرمائیے اور انصاف کیجیے کہ زیادتی کس طرف سے تھی کیا مسلمان بزورشمشیر اسلام پھیلا رہے ہیں یا کافروں کی تلواروں کے خوف کے باوجود اسلام پھیل رہا ہے''۔(۱۴)

مندرجہ بالا دلیل سادہ ہونے کے باوجود بہت وزنی اور جاندار ہے اور بھرپور طریقے سے مدافعت کا فریضہ سرانجام دیتے دکھائی دیتی ہے۔

آپؐ کے امی ہونے کے متعلق اعتراض کا دفاع مصنف کچھ یوں کرتا ہے:

> ''اول آنحضرت ﷺ کی ناخواندگی کو لیجیے اگر آپ ﷺ تعلیم یافتہ ہوتے تو آپ ﷺ کو دیگر مصنفین کے خیالات سے کتنی مدد ملتی بلکہ اس صورت میں ادھر یوروپین محققین آنحضرت ﷺ کی تمام اصلاحوں کا شجرۂ نسب گریک فلاسفی اور روشن تہذیب سے ملاتے اور فرماتے کہ ان میں سے کون سی خود

انہوں نے نکالی تھی فلاں اصلاح فلاں حکیم کی نصائح میں سے اخذ کی تھی اور
فلاں بات فلاں کتاب سے لی تھی اور ہمارے ہندو بھائیوں کو اپنے اس
دعوے اور فخر کی صداقت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہتی کہ یہ سب
باتیں سنسکرت کتابوں سے اخذ کی گئی ہیں''۔(۱۵)

مسلمانوں کے دشمن کی نشاندہی: کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں اسلام کا معنی ومفہوم، لفظ اسلام اور دھرم کی مماثلت، حضرت آدم اور منومہاراج کی شخصیت کی مماثلت اور رسم ستی وغیرہ کا ذکر ہے۔اس کے علاوہ مسلمانوں کو روح اسلام کو سمجھنے اور باہمی رواداری کو فروغ دینے پر ابھارا گیا ہے۔مصنف نے اس ضمیمہ میں مسلمانوں کے تین بڑے دشمن قرار دیئے ہیں۔

۱- دقیانوسی خیال کے مولوی جو حضور اکرم ﷺ کی سپرٹ اور عام میلان کو نہیں سمجھتے اور ایک ایک لفظ پر اڑتے ہیں۔

۲- وہ اصلاح کرنے والے جو مولویوں کے بالکل برعکس ہیں۔مولوی صاحبان قطب شمالی پر سے قدم نہیں ہلا سکتے تو یہ مصلح ایک دم قطب جنوبی پر پہنچتے ہیں، اسلام کو ہر امر واجب اور غیر واجب میں یورپ کی تہذیب کا پیرو بلکہ غلام بنادینا چاہتے ہیں۔(۱۶)

۳- حب جاہ والے ہادیان اسلام جن کو دین، اخلاق ،اسلام اور خدا سے درحقیقت کچھ واسطہ نہیں۔

مصنف ان دشمنوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے اور اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ ہندو اور مسلمان آپس میں جاہلانہ طور پر لڑنے کی بجائے شریفانہ اور خاموش مباحثہ شروع کردیں۔

بابو گنج لال دلوالی نے آج سے تقریباً اسی سال پہلے مسلمانوں کے جن تین دشمنوں کی نشان دہی کی تھی آج کے معروضی حالات بابو گنج لال کی بات کی تصدیق کرتے دکھائی دیتے ہیں۔تاریخ اور موجودہ صورت حال اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہی تین طبقات ہیں جنھوں نے عالم اسلام اور مسلمانوں کے تشخص کو نہ صرف بری طرح متاثر کیا بلکہ افراط وتفریط کا شکار ہوکر اسلام کی روح کو نقصان پہنچانے کے ساتھ ساتھ عالم اسلام کے زوال میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

مندرجہ بالا دشمنوں کی نشاندہی مصنف کے فہم وفراست اور دور اندیشی کا واضح ثبوت ہے۔

حوالہ جات

☆ تلاش بسیار کے باوجود مصنف کے حالات زندگی میسر نہیں آسکے۔

(۱) انور محمود خالد، اردو نثر میں سیرت رسول، (اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۸۹ء) ص ۴۶۸۔ (۲) ممتاز لیاقت، برصغیر میں سیرت نگاری، فکر ونظر (اسلام آباد) ج ۳۰، ش ۱-۲، دسمبر ۱۹۹۲ء، ص ۳۷۱۔ (۳) صدیقی، مظفر عالم جاوید، اردو میں میلاد النبیؐ، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۱۹۹۸ء) ص ۸۰۹۔ (۴) اسد سلیم، شیخ، انسائیکلو پیڈیا تحریک پاکستان، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء)، ص ۸۰۹۔ (۵) سرور گیلانی، سید، جگت مہارشی، (دفتر اشاعت سیرت، مصری شاہ لاہور)، ص ۱۔ (۶) صدیقی، مظفر عالم، اردو میں میلاد النبیؐ، ص ۸۲۹۔ (۷) ایضاً۔ (۸) پھلواروی، شاہ محمد جعفر، پیغمبر انسانیت، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، س۔ن) ص ح۔ (۹) دلوالی، بابو گنج لال، حضرت محمدؐ اور اسلام، (دہلی: جید برقی پریس بلی ماران، س۔ن) ص ۳، ۴۔ (۱۰) ایضاً۔ (۱۱) ایضاً، ص ۱۰۔ (۱۲) ایضاً، ص ۴۴۔ (۱۳) ایضاً، ص ۳۷۔ (۱۴) ایضاً۔ (۱۵) ایضاً، ص ۳۳۔ (۱۶) ایضاً، ص ۵۷۔

محمد ذکی اردو کے گمنام مصنف

وقار عظیم ندوی

محمد ذکی صاحب اردو کے معتبر نثر نگار اور علم النفس کی شاخ فرینالوجی (علم کاسہ سر یا علم الجمجمۃ)(۱) پر اردو میں اولین کتاب کے مصنف ضلع اعظم گڈھ کے موضع اوندرا میں جون ۱۸۹۵ء (۱۳۱۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ ضلعوں کی نئی تقسیم کے بعد موضع اوندرا اب ضلع مئو میں ہے۔ محمد ذکی صاحب کا نسب شیخ محمد بن شیخ احمد عرف ملاجیون امیٹھوی سے ملتا ہے۔ عالم گیر کی عطا کردہ معافی کی ایک جائداد کے تعلق سے ملاجیون کے فرزند شیخ محمد اپنے خاندان کے ساتھ موضع اوندرا کے قریب نتھو پور قصبہ کے قاضی چک میں آباد ہوگئے تھے۔ نتھو پور بعد کی کسی سیاسی شورش و بغاوت کے سلسلہ میں توپوں سے اڑا دیا گیا۔ البتہ بعض پرانی عمارتیں اور مساجد و مقبرہ کے آثار وہاں اب بھی موجود ہیں۔ موضع اوندرا کو منتقلی جو نتھو پور سے جنوب میں تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، ۱۷۰۷ء کے کچھ قبل یا بعد پیش آئی۔ نتھو پور کا ذکر سرسری طور پر ''حیات شبلی'' میں اعظم گڈھ کے تذکرہ میں بھی آیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نتھو پور کی حیثیت سے واقف تھے۔ اس سلسلہ کلام میں حیات شبلی کا ذکر کچھ بے محل اس لیے نہیں ہے کہ مصنف نے اس کتاب میں حیرت ناک طور پر مروج اسلوب تذکرہ نگاری سے ہٹ کر زیر بحث شخصیت کے زمان و مکان کا ایسا احاطہ کیا ہے جو کتنے ہی نایاب علمی سراغوں پر محیط ہوگیا ہے۔(۲)

محمد ذکی صاحب کی وفات اوندرا ہی میں ۲۸/نومبر ۱۹۷۵ء میں ہوئی۔ والد محمد وصی صاحب (۱۸۴۶ء-۳/فروری ۱۹۰۳ء) ڈپٹی کلکٹر تھے جو توبۃ النصوح کے مصنف ڈپٹی نذیر احمد کے ہم عصر اور ملازمت میں ان کے سینئر تھے، ان کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ مرحوم نے سب سے پہلے

ریاض، سعودی عرب۔

حکومت وقت کو سرکاری ملازمین کے لیے پراویڈنٹ فنڈ قائم کرنے کا تصور پیش کیا۔ متعلقہ موضوع پر ان کا کتابچہ انگریزی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس سے شائع ہوا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی معین الملازمین کے نام سے شائع ہوا۔

محمد ذکی صاحب زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، آزاد منش تھے اور طبیعت میں قناعت پسندی تھی، اس لیے آبائی ذرائع پر قناعت کرتے ہوئے کوئی ذریعہ معاش اختیار نہیں کیا۔ اردو، فارسی، انگریزی، تاریخ، فلسفہ و علم النفس (سائیکالوجی) میں گہری قابلیت رکھتے تھے۔ علم النفس کی شاخ فرینالوجی (علم کاسہ سر یا علم الجمجمۃ) سے خاص دلچسپی تھی۔ اس موضوع پر دو کتابیں تیار کیں جن میں پہلی کتاب ''دماغی تربیت'' مشہور مصنف جیمس ایلن کی کتاب ''ہاؤ ٹو کلٹیویٹ دی مائنڈ (How to cultivate the mind) کا اردو ترجمہ تھی اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہو کر اکابر وقت سے داد تحسین وصول کی۔ دوسری کتاب ''فلسفہ دماغ'' کے نام سے خود اپنی تالیف تھی جو مسودہ غائب ہونے کی وجہ سے اس وقت زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔ اس تالیف کا مقدمہ اور چند ابواب سہ ماہی ایشیا، میرٹھ اور الامین، بہار شریف پٹنہ میں شائع ہوئے تھے۔ مسودہ کسی قدر ناقص شکل میں مصنف کو بعد میں بازیاب ضرور ہوا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کو جس دور یتیمی سے گزرنا پڑا اس میں اردو کی کتب ادب کی تو پوچھ کسی حد تک باقی رہی مگر علوم و فنون پر فنی تالیفات کے لیے اردو کے خود اپنے وطن ہندوستان کا دامن تنگ ہونے لگا۔ لہٰذا ''فلسفہ دماغ'' طباعت کے مرحلہ سے نہ گزر سکی۔

محمد ذکی صاحب اپنے وقت کے اہم اداروں و شخصیات کے ربط میں برابر رہے۔ دارالمصنفین اعظم گڈھ کی شخصیات علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مسعود علی ندویؒ اور مولانا نجیب اشرف ندویؒ سے دیرینہ تعلق تھا۔ اپنی کتاب دماغی تربیت کی تیاری میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کے اساطین سے انگریزی اصطلاحات کے اردو ترجموں کے سلسلے میں مشاورت کی، جس کی شہادت مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا نجیب اشرف ندویؒ کے ان خطوط سے ملتی ہے جو محمد ذکی صاحب نے چھوڑے ہیں جن کا تذکرہ آگے آئے گا۔

محمد ذکی صاحب کی علامہ شبلی نعمانی سے ان کی وفات سے پہلے ایک ملاقات کا بھی ذکر

ملتا ہے مگر محمد ذکی صاحب کی صغر سنی اور علامہ سے پہلی و آخری ملاقات کی وجہ سے کسی ذاتی استفادہ کا موقع نہیں ملا، البتہ تصنیفات شبلی بلکہ دبستان شبلی سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

دارالمصنّفین کی آمد و رفت کے ہی ضمن میں وہاں کسی شام قیام کے دوران پنڈت جواہرلعل نہرو سے ملاقات ہوئی جس کے حوالہ سے پنڈت جی کے وزیراعظم بننے کے بعد طرفین میں خطوط کا ایک سے زیادہ بار اردو اور انگریزی میں تبادلہ ہوا جن میں کسی خط میں پنڈت جی نے دارالمصنّفین کی شام کی ملاقات کی یاد باقی رہنے کا ذکر کیا تھا۔ محمد ذکی صاحب نے پنڈت جی کے یہ خطوط جگن ناتھ آزاد صدر شعبہ اردو سری نگر یونیورسٹی، کشمیر کی درخواست پر انہیں ارسال کردیے تھے جن کا عکس اس وقت پنڈت جی پر شائع کردہ سوینئر میں محمد ذکی صاحب کے حوالہ سے شائع ہوا۔

دماغی تربیت: پہلی کتاب ''دماغی تربیت''، جو جیمس ایلن کی کتاب ''ہاؤ ٹو کلٹیو یٹ دی مائنڈ'' (How to cultivate the mind) کا اردو ترجمہ ہے، کے دیباچہ میں ذکی صاحب مذکورہ کتاب کے ترجمہ کی وجہ بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں، ''اردو زبان اب تک فرینالوجی (علم کاسہ سر) سے بالکل محروم ہے اس میں کسی مستقل تالیف کا وجود ہونا تو درکنار غالبًا کوئی ترجمہ بھی موجود نہ ہوگا۔ اس اعتبار سے فرینالوجی کی یہ پہلی کتاب ہوگی جو اردو داں پبلک کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہ قلیل الضخامت کتاب مفید معلومات اور قابل قدر علمی مضامین سے عبارت ہے جس میں فرینالوجی کے حقائق مفصل و مدلل طور پر واضح کرکے اس کے فوائد ونتائج پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ گویا علم کاسہ سر کا ایک عمدہ دیباچہ خود یہ کتاب ہے۔ (۳)

کتاب کے دیگر اہم عناوین یہ ہیں: تمہید، تندرستی، پیشہ، باقاعدہ تربیت، مطالعہ، سوچنا، انشاء پردازی، تقریر و گفتگو، خاتمہ۔ چند اقتباسات بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں:

سوچنا: جس طرح پڑھنے کا اچھا اور برا طریقہ ہے اسی طرح سوچنے کا بھی صحیح و غلط اصول ہے۔ سوچنے کا فعل صرف خیالات پر نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ جلد یا بدیر تباہ کن ثابت ہوگا۔ مطالعہ کی طرح سوچنے کے فعل کو بھی باقاعدہ طور پر جاری رکھنا چاہیے۔ مطالعہ کے بعد اس کی ابتدا ہوتی ہے۔ مطالعہ دماغ کی غذا ہے مگر سوچنا اس کا ہاضمہ ہے۔

انشاء پردازی: یہ ذاتی تربیت کا ایک اعلیٰ ذریعہ ہے۔ کسی شخص کو باقاعدہ اور کامل بنا

دینا اس کا براہ راست عمل ہے۔اس سے استعداد لغوی میں ترقی ہوتی ہے۔قوت ممیّزہ یا تنقید کو ابھارتی وسنوارتی ہے۔انشاء پردازی دماغ کے لیے اہم عمدہ مشق ہے۔

تندرستی: ہر عمارت جسے مستحکم رہنا اور جس غرض سے بنائی گئی ہو اس کو پوری کرنا ہے تو اس کی بنیاد اچھی ہونی چاہیے اور ہر فرد جو سوسائٹی میں کسی حقیقی مصرف کا ہونا چاہتا ہے اس کو کافی جسمانی طاقت اور توانائی رکھنی چاہیے۔جسم اور دماغ کے مابین اتنا قرب ہے کہ جو کچھ ایک کو متاثر کرتا ہے دوسرے پر بھی اثر ڈالتا ہے اور ان کے مابین عمل ہوتا ہے۔

خاتمہ: ایک غیر تربیت یافتہ دماغ کی تشبیہ غیر مزروعہ باغ سے دی جاسکتی ہے جس کو مفید، زرخیز اور خوشنما بنانے کے لیے کھودنے اور جوتنے کی ضرورت ہوتی۔دماغ کی تربیت کرنے میں پہلے زینہ پر اپنی تمام بری عادتوں کو زہریلی گھاس سمجھ کر ان کی بیخ کنی کرنی چاہیے۔

محمد ذکی صاحب کی تحریروں کی روشنی میں فرینالوجی کے تعارف واہمیت کے بیان کے لیے قدرے تفصیل درکار ہے جس کا یہ مضمون متحمل نہیں ہے۔علم فرینالوجی کی بنیاد یہ ہے کہ دماغ کا مستقر سر ہے جو تمام جذبات واعمال نفسی کا مرکز ہے، نیز مغز کے متعدد حصوں (آلات) کے وظائف جداگانہ ہیں اور مختلف قوائے ذہنی اپنے مخصوص آلات کے تابع ہیں، یعنی جملہ اعمال نفسی انہیں حصص مغز کے ماتحت انجام پاتے ہیں، گویا ہر فعل وجذبہ کی تکوین اپنے آلہ کے مطابق اور متناسب ہوتی ہے۔محمد ذکی صاحب فرینالوجی کا ایک اصول بیان کرتے ہیں ''جسامت ایک پیمانہ ہے قوت کا'' (۴)۔یعنی بالفاظ دیگر جس نسبت سے مغز بڑا ہوگا دماغی قوتیں اتنی زیادہ ہوں گی۔ فرینالوجی کے اصولوں پر عمل کر کے افراد کی عقلی صلاحیتوں کی تشخیص کی جاسکتی ہے اور متعدد بیش بہا خفتہ صلاحیتوں کو ضائع ہونے بچایا جاسکتا ہے۔

محمد ذکی صاحب نے مسٹر جیمس ایلن کی انگریزی کتاب ''ہاؤ ٹو کلٹیویٹ دی مائنڈ'' کا اردو ترجمہ کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس کی کہ اس فن کو اردو داں طبقہ کے نزدیک سند حاصل ہوسکے۔پھر انہوں نے فن پر اپنی کتاب تیار کی جو خاص حالات کی بنا پر تشنہ طباعت رہ گئی۔البتہ کبھی دماغی تربیت وفلسفہ دماغ کے ساتھ فرینالوجی پر محمد ذکی صاحب کے مختلف مطبوعہ مضامین کو بطور مقدمہ یکجا شائع کیا جاسکا تو اردو میں یہ ایک وقیع اضافہ ہوگا۔

جن رسالوں نے محمد ذکی صاحب کی ترجمہ کردہ کتاب پر تبصرے شائع کیے اور سراہا ان میں ''معارف''اعظم گڈھ، سہ ماہی ''ایشیا'' میرٹھ، ''الامین'' بہار شریف، رسالہ ''اردو'' اورنگ آباد، ''اخبار مشرق'' گورکھپور، رسالہ ''دین ودنیا'' دہلی، اخبار ''ذوالقرنین'' بدایوں شامل ہیں۔

اس پر ماہنامہ معارف اعظم گڈھ مئی رجون ۱۹۲۱ء کے شمارہ میں یہ تبصرہ شائع ہوا:

''مولوی محمد ذکی بن مولوی محمد وصی صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر نے اس کتاب کا اردو زبان میں سلیس ترجمہ کیا ہے۔ یہ اردو میں فرینالوجی کی پہلی کتاب ہے اور دیکھنے کے لائق ہے''۔(ص۴۶۳)

لسان العصر حضرت اکبرالہ آبادی نے اپنے ایک خط میں ان الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا: ''آپ نے عمدہ کام میں وقت صرف کیا اور داد کے مستحق ہیں۔ کتاب تربیت دماغ بہت ضروری اور مفید ہے''۔(یہ خط آگے پورا نقل کیا جائے گا)

فلسفہ دماغ: محمد ذکی صاحب نے دوسری کتاب ''فلسفہ دماغ'' کے عنوان سے خود اپنی تصنیف کی جو خاص حالات کی وجہ سے تشنہ طباعت رہ گئی۔ اس کتاب کا مقدمہ بہت پر مغز ہے جو دراصل تاریخ فلسفہ کی روشنی میں فرینالوجی پر مبسوط تبصرہ ہے جس میں اس علم کے اصول اساسی، مخالفین فرینالوجی کے دلائل اور ان کے رد سے بطور خاص بحث کی گئی ہے۔ یہ مقدمہ سہ ماہی ایشیا، میرٹھ کے شمارہ اپریل، مئی، جون ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ساغر نظامی مدیر ایشیا تحریر فرماتے ہیں:

''فلسفہ دماغ کا جہاں تک تعلق ہے وہ نہایت تحقیق وتدقیق، غور وفکر اور مطالعہ کا نتیجہ ہے، جس میں فرینالوجی، اس کے نظریہ، اس کے ارتقاء، پھر اس کے نتائج پر نہایت حکیمانہ بحث کی گئی ہے''۔(۵)

کتاب فلسفہ دماغ کو مصنف نے ۱۵ ضمنی عنوانات پر تقسیم کیا تھا۔ ان میں مثال کے طور پر چند درج ذیل ہیں: آرزوئے حیات، مقاومت، شہوت جنسی، الفت ازدواجی، حب اولاد، رفاقت، سکونت پذیری، غضب، اشتہا، حرص، خفا، احتیاط، تکبر، خودداری، استقلال، ایمان داری، امید، عظمت، احترام، ہمدردی، تشکیل، وقار، تقلید، تربیت، ظرافت، قوائے مدرکہ، بداہت، رضاجوئی، استعداد فکری، قوت استقرائی، موازنہ، تصور شکلی، مقدار، وزن، رنگ، ترتیب، قوائے مدرکہ،

حسابیت ذہنی، موقعیت، حافظہ، مرکزیت، نخوت، انانیت، خودداری، استقلال، ایمان داری، توجہ، تخیل، ادراک وتعقل وغیرہ۔

مصنف نے فرینالوجی کے نقطہ نظر سے ان موضوعات پر بحث کے دوران سب سے پہلے ان قوی کا انسانی دماغ میں مقام متعین کیا ہے، پھر اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

امید: یہ قوت احتیاط کے آگے کچھ اوپر کی طرف ہٹ کر واقع ہے اس کا اثر یہ ہے کہ انسان جلد مایوس نہیں ہوتا اور ہمیشہ شاندار مستقبل کی توقع رکھتا ہے......الخ۔

ہمدردی: یہ قوت پیشانی پر واقع ہوتی ہے۔ جس کی پیشانی کشادہ ہوتی ہے وہ نیک، خلیق ورحم دل ہوتا ہے اور اس کا دائرۂ ہمدردی وسیع ہوتا جس میں تمام مخلوقات شامل ہیں۔

قوت جنسی: یہ قوت انسان کے مغز میں کان کے پیچھے سب سے نیچے ہوتی ہے اور بقائے نسل انسانی کا باعث ہے۔ کان کے پیچھے جب کسی شخص کی گردن کا بالائی حصہ چوڑا نظر آئے تو زیادتی شہوت کی دلیل ہے۔

خطوط مشاہیر: محمد ذکی صاحب کی اپنی شخصیت پر روشنی ان کی اپنی تالیفات وشائع شدہ تحریروں کے علاوہ چند شخصیات وقت کے ان خطوط وتبصروں سے پڑتی ہے جو موجود ہیں۔ یہ خطوط اب تک غیر شائع شدہ ہیں۔ کچھ مختصر، کچھ طویل، اردو وانگریزی دونوں زبانوں میں ہیں۔ ان میں کچھ خطوط میں بعض اہم موضوعات سے بحث کی گئی ہے، مثلاً علامہ اقبال کا ایک خط بیعت سے متعلق ہے جو آگے آئے گا۔ خطوط نویس شخصیات میں سرفہرست نام علامہ سید سلیمان ندوی، شاعر مشرق علامہ اقبال، لسان العصر اکبر حسین الہ آبادی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا نجیب اشرف ندوی، پنڈت جواہر لعل نہرو، بیرسٹر قاضی عزیز الدین احمد (وزیر تعلیم و دیوان، ریاست دیتا) اور عابد حسین خان بی اے (علیگ) ہیں۔

محمد ذکی صاحب کو موصول شدہ مشاہیر کے جو خطوط موجود ہیں اور اب تک سارے ہی غیر مطبوعہ ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے: علامہ سید سلیمان ندوی ۱/عدد، شاعر مشرق علامہ اقبال ۷/عدد جن میں دو بہ زبان انگریزی، لسان العصر اکبر حسین الہ آبادی ۱/عدد، مولانا عبدالماجد دریابادی

ا/عدد، مولانا نجیب اشرف ندوی ا/عدد۔

علامہ سید سلیمان ندوی کا خط پوسٹ کارڈ کی شکل میں ہے جس میں موصوف نے ۶ عدد انگریزی اصطلاحات کے بالمقابل اردو اصطلاحات درج کی ہیں۔ وہ اصطلاحات ہیں:

توجہ، تخیل، ادراک، تعقل، حافظہ اور ابتدائی۔

اسی طرح مولانا نجیب اشرف ندوی کا خط مجموعی طور پر چار صفحات کا ہے جن میں تین صفحات میں علم النفس اور فرینالوجی کی انگریزی اصطلاحات کے بالمقابل اردو اصطلاحات کی تصحیح یا اضافے کیے گئے ہیں۔

لسان العصر اکبر حسین الہ آبادی نے اپنے خط میں کتاب ''دماغی تربیت'' کی داد ان الفاظ میں دی ہے:

> ''کتاب تربیت دماغ بہت ضروری و مفید ہے۔ آپ نے عمدہ کام میں اپنا وقت صرف کیا اور داد کے مستحق ہیں۔ آپ کی عبارت بہت سلجھی ہوئی اور مضبوط و مربوط ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ کتاب ممتاز و نمایاں ہے۔ امید ہے کہ دکن اور نیز آپ کے وطن میں اس کی بہت قدر کی جائے گی''۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کے خط سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ محمد ذکی صاحب نے مولانا دریابادی کی کسی تالیف پر تحسینی خط لکھا ہوگا جس کا وہ جواب ہے۔ غالب گمان ہے کہ وہ کتاب فلسفہ جذبات ہوگی۔

شاعر مشرق علامہ اقبال کے سات عدد خطوط جو اردو اور انگریزی دونوں میں ہیں اور مئی ۱۹۱۶ء تا فروری ۱۹۲۶ء کے عرصہ پر محیط ہیں یہ بتاتے ہیں کہ محمد ذکی صاحب علامہ اقبال کے بڑے قدردان و مداح ہی نہیں تھے بلکہ اپنے ذاتی و قانونی معاملات میں بھی مشورہ کر لیتے تھے۔ علامہ اقبال کا ۱۸/مئی ۱۹۱۶ء کا خط دو صفحوں پر مشتمل ہے جس میں موصوف نے تین نقاط کا نمبروار جواب دیا ہے۔ اس خط کا حق ہے کہ اس پر مستقل مضمون میں روشنی ڈالی جائے۔ اس خط سے ترشح ہوتا ہے کہ محمد ذکی صاحب نے خود علامہ اقبال سے رشتہ تربیت قائم کرنا چاہا اور بصورت دیگر کسی دوسری شخصیت کی طرف رہنمائی کی درخواست کی جس سے یہ تعلق قائم کیا جاسکے۔ علامہ

اقبال نے اپنے متعلق بھر پور تواضع کے ساتھ معذرت کی ہے اور مکتوب الیہ کو قرآن سے ربط بڑھانے کا مشورہ دیا ہے۔موصوف لکھتے ہیں:

''قرآن شریف کو توجہ سے پڑھیے، اکثر اوقات یہ کتاب اپنے مطالب اپنے پڑھنے والے کے دل پر خود بخود واضح کر دیا کرتی ہے''۔

ایک دوسرے خط میں جو ۱۱/ مارچ ۱۹۱۷ء کا ہے علامہ اقبال تحریر فرماتے ہیں:

''مثنوی اسرار خودی کا دوسرا حصہ قریباً تیار ہے جو جلد شائع ہوگا۔ پہلا حصہ قدرے ترمیم طلب ہے۔ضروری ترمیمیں کر رہا ہوں، چونکہ اس کے ساتھ بعض بعض جگہ حواشی ہوں گے اس واسطے کسی اور آدمی کے بس کا یہ کام نہیں ہے''۔

اسی طرح ۱۲/ جون ۱۹۱۷ء کا خط انگریزی میں ہے جس میں یہ قانونی مشورہ دیا گیا ہے کہ آپ براہ راست کمانڈر ان چیف آف انڈیا کو عریضہ بھیج سکتے ہیں۔

محمد ذکی صاحب کے نام جن مشاہیر کے خطوط کا اجمالاً تذکرہ اوپر گزرا ہے ان کے پورے متون مع ان کے عکس اگلی قسط میں پیش کیے جائیں گے۔ یہ خطوط ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔

حوالہ جات

(۱) فرینالوجی (علم کاسہ سر) ایک سائنس ہے جس کی ابتدا ۱۷۹۶ء میں ہوئی۔اس کی ایجاد کا فخر اس زمانہ کے فلسفی ڈاکٹر گال کو حاصل ہے۔اس کے بعد ڈاکٹر اپرزیم اور کومب وغیرہ نے بہت کچھ اضافہ کر کے اس علم کو مکمل کیا۔رفتہ رفتہ ماہران فن نے ترقی دی۔اس فن کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ دماغ کے مختلف قوی اس کے مخصوص حصوں سے تعلق رکھتے ہیں اور کھوپڑی کی بالائی سطح کو جانچنے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔(دماغی تربیت، حاشیہ ص ۵) (۲) مذکورہ علاقہ کی تاریخ وجغرافیہ سے سید سلیمان ندویؒ کی واقفیت کا اندازہ کئی قسطوں میں شائع شدہ ان کے مقالہ ''شیراز ہند پورب'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ (۳) دماغی تربیت، دیباچہ، ص ا، مطبوعہ معارف پریس، اعظم گڈہ، ۱۹۲۱ء۔ (۴) مقدمہ فلسفہ دماغ، سہ ماہی ایشیا، اپریل ،مئی، جون ۱۹۳۸ء، ص ۲۴۔ (۵) صفحہ ۱۱۔

مصر۔ تعارف و تجزیہ

ڈاکٹر محمد انظر ندوی

مصر عالم عرب کا سب سے بڑا ملک ہے، آبادی کے لحاظ سے بھی اور تہذیبی اور عالمی ترقی کے لحاظ سے بھی۔ یہ عرب کی قیادت کرنے والا ملک ہے۔ مصر ہند و پاک کی طرح سیاسی اور عالمی تحریکوں کی روایات کا حامل ہے۔ اسے مسلم ممالک میں نہایت اہمیت حاصل ہے۔ شمالی افریقہ کا یہ ملک اپنے تہذیبی نقطہ نظر سے بہت قدیم بھی ہے اور جدید بھی، قدیم تہذیب کے تعلق سے شمالی افریقہ کا کوئی بھی ملک اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، اس نے دنیا کے بہت سے انقلابات دیکھے ہیں، بہت سی قوموں نے وہاں حکومت کی ہے، یہی وہ خطہ ہے جہاں بہت سی قومیں پھلی پھولی ہیں اور ان میں بہت سی اب موجود بھی نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں ایک سے زائد مقام پر مصر کا ذکر آیا ہے۔ یہیں جامعہ ازہر جیسی یونیورسٹی ہے جسے مسلم دنیا میں نہایت عزت و توقیر حاصل ہے۔

مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کے اس اہم ملک مصر گذشتہ سال اپنی عوامی تحریک کے لیے خبروں میں نمایاں رہا سال رواں ۱۱/فروری سال ۲۰۱۱ء جب یہاں حسنی مبارک حکومت کا خاتمہ ہوا تھا، یہ وہ ملک ہے جس کے پاس ایک طرف عرب ملکوں کی نمایندہ تنظیم عرب لیگ کی کمان ہے تو دوسری طرف وہ خطے میں امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کا سب سے بڑا حلیف ملک ہے، تیسری طرف اس کے سفارتی تعلقات اسرائیل کے ساتھ بھی ہیں۔

عرب دنیا میں ہونے والی سیاسی اور فکری تبدیلیوں میں ہمیشہ مصر کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ اول تو اس کی اہمیت فوجی اور اقتصادی وجہ سے ہے کہ اس کے پاس نہر سوئز کی شکل میں یورپ سے ایشیا اور بحر الکاہل تک کی تجارت کی اہم ترین آبی گذرگاہ ہے۔ دوم یہ تین جنگوں کا مرکز رہ چکا ہے جن

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی ادب، انگلش اینڈ فورین لینگویجز یونیورسٹی، حیدرآباد۔

میں سے ۱۹۵۸ء، ۱۹۶۷ءاور ۱۹۷۴ءکی جنگیں شامل ہیں۔ جمال عبدالناصر نے اسے عرب دنیا میں مرکزی اہمیت دینے کے لیے اس کا نام جمہوریہ مصر رکھا۔ ان کے زمانہ میں یہ ملک سوشلسٹ اور غیر جانب دار تحریک میں بہت فعال تھا جس کی قیادت چین، بھارت اور انڈونیشیا کے پاس تھی۔ اسی زمانے میں اس نے افروایشیائی بلاک کی تشکیل میں فعال اور بنیادی کردار ادا کیا، مصر کا ریڈیو جسے صوت العرب یعنی عرب کی آواز کا نام دیا گیا، عرب دنیا خصوصاً نوجوانوں میں خاصا مقبول تھا۔ اس ریڈیو کی نشریات کا نشانہ عمومی طور پر روایتی بادشاہتوں کی ریاستیں رہیں، جس کی وجہ سے گو ان کے اور مصر کے درمیان ایک فاصلہ رہا تاہم عرب دنیا کے نوجوان مصر کی تحریکوں سے متاثر رہے۔

مصر کی تاریخ ایک نظر میں: مصر کی قدیم تہذیب کے آثار قدیمہ ۴۰۰۰ سال قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں، متحدہ مملکت کی شکل میں یہ ملک ۳۲۰۰ قبل مسیح میں ابھر کر سامنے آیا جو جنوب میں نامبیا سے شمال میں شام تک پھیلا ہوا تھا، غلامی، زرخیز زمین اور دریائے نیل کے سالانہ سیلاب پر مبنی معیشت نے حکمرانوں اور پجاریوں کا ایک اعلیٰ کلچر پیدا کر دیا تھا ایشیائی حملہ آوروں (ہائی کوس، آسیریوں) کے طفیل اس طبقہ کا زوال ہوا، آخری شہنشاہیت کا ۳۴۱ قبل مسیح میں ایرانیوں کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔ ان کے بعد یونانی، رومی، بازنطینی دور رہا آخر میں عرب آئے جنہوں نے دین اسلام اور عربی زبان کو متعارف کرایا۔ قدیم مصری زبان محض یادگار کے طور پر محفوظ رہ گئی۔

مصر میں باقاعدہ عیسائی حکومت کا عدم قیام: مصر ایک ایسا ملک ہے جہاں کبھی عیسائیوں کی باقاعدہ حکومت بھی قائم نہ ہو سکی۔ قبل مسیح میں جو حکومتیں آئیں وہ عیسائی نہیں تھیں کیونکہ وہ عیسیٰؑ سے پہلے کی تھیں، وہ بت پرست تھیں، عیسیٰؑ کے بعد کافی دنوں تک یہودیوں کا اثر رہا۔ پھر مسلمانوں کا زمانہ آیا، نپولین بوناپارٹ جیسے حکمرانوں نے مصر پر قبضہ ضرور کیا لیکن مصر میں عیسائی مذہب کو فروغ نہیں ملا، یہ الگ بات ہے کہ عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کے بعد بہت سے یہودی عیسائی ہو گئے تھے لیکن مسلمانوں کے ہاتھوں میں جب اقتدار آیا تو انہوں نے عیسائیوں کے ساتھ کوئی خراب سلوک نہیں کیا۔ مذہبی اعتبار سے مصر میں مسلمان ۹۴ فیصد (غالب اکثریت سنی)، قبطی ۵ فیصد اور عیسائی ایک فیصد ہیں۔

مصر قدیم تہذیبوں کی سرزمین: مصر، دنیا کی قدیم تہذیب کا گہوارہ ہے جو زمانہ ماقبل

تاریخ کے اپنے تہذیبی اثاثوں سے آج بھی دنیا کی تاریخ کو قابل فخر بناتا ہے، جس سرزمین کو ابراہیمؑ نے شرف قدوم بخشا، جس ملک سے حضرت ہاجرہؑ کی نسبت نے اسے ام الدنیا (دنیا کی ماں) بنادیا، جہاں یوسفؑ نے صدق وامانت پر مبنی اقتصادی مملکت کا نمونہ پیش کیا اور جہاں موسیٰؑ وہارونؑ نے حق وباطل کی طویل کشمکش کا نمونہ پیش کیا۔

مصر کی تہذیب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ماضی کی ان تہذیبوں میں ایک ہے، جن کی بنیاد تعلیم پر تھی، اس علاقے کے اولین تمدن نے چراغ کی روشنی میں پرورش پائی اور اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کی بنیادوں میں انبیائے کرامؑ کی مساعی کارفرما ہیں، یہ دعوی محتاج دلائل نہیں کہ مصر کی تہذیب ہی افریقی اور یوروپی تہذیبوں کا سرچشمہ ہے، یونان اور روم کی تہذیبیں دراصل مصری تہذیب کی خلف روتھیں۔ سرزمین مصر کو تہذیبی وتمدنی وثقافتی اہمیت کے ساتھ متعدد مذاہب کے انتساب کا شرف بھی حاصل ہے۔

باشندگان مصر بنیادی طور پر قبائل میں تقسیم ہیں ہر قبیلہ اپنی شناخت رکھتا ہے اور آباء واجداد کے حوالہ سے دوسرے قبائل سے رشتہ بھی جوڑتا ہے، اسلام یہاں کا سرکاری اور قومی مذہب ہے، آج بھی یہاں نماز کے اوقات میں مساجد بھر جاتی ہیں اور کاروبار زندگی مدھم پڑ جاتا ہے، یہاں کا موسم رمضان اور حج اپنی تہذیبی دلکشی کے ساتھ نہایت پر رونق نظر آتا ہے۔

تاریخ عالم میں مصر کو جو مقام حاصل ہے وہ بہت کم ملکوں کو نصیب ہے، ایشیا وافریقہ کے سنگم ہونے اور شمالی ساحل سے بحر متوسط کے ذریعہ یورپ کے ساحلوں تک پہنچانے کے ذریعہ بننے اور نہر سوئز کو رگ جاں کی طرح عزیز رکھنے کی وجہ سے یہ آج بھی ان مشرق ومغرب کی اقتصادی سرگرمیوں کے لیے نہر سویس کی اہمیت سے کون واقف نہیں، دستیاب تاریخی شواہد کی تصدیق کرتا ہے کہ دنیا کی سب سے پہلی منظّم اور مرکزی حکومت کا قیام اسی سرزمین پر عمل میں آیا۔

مصر کے باشندوں نے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں کا حق بھی ہمیشہ بطریق احسن ادا کیا، فنون لطیفہ، صنعت وحرفت، جہاز رانی، کاغذ سازی، زراعت وآب پاشی جیسے تہذیبی تقاضوں کو ادا کرنے میں مصریوں کو بجا طور پر تاریخ عالم میں سبقت حاصل ہے۔ اس کی داستان تفصیل طلب ہے، مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ

قدیم حساب اور علم نجوم میں وہ ابتدائے تمدن سے نامور ہوئے ۳۶۵ دنوں کا کلینڈر ان ہی کی ایجاد ہے۔تصویروں کے ذریعہ لکھنے کا طریقہ بھی ان ہی کا تھا۔آج بھی اہرام مصر کی دیواروں پر سیاح وہ تصویریں دیکھتے ہیں جو صرف خوبصورتی کے لیے نہیں بنائی گئی تھیں بلکہ ان کے ذریعہ ایک خاص پیغام دیا جاتا تھا۔ ہر تصویر کسی خیال یا آواز کو ظاہر کرنے کے لیے بنائی جاتی۔مصر کی طبابت بھی مشہور عالم تھی، بحری جہاز رانی میں مصریوں کی سبقت اور ترقی معروف و مسلم ہے۔

اسی بے مثال ترقی نے فرعون کا ذہنی توازن بگاڑ دیا اور وہ نشہ اقتدار میں خدائی کا دعوی کر بیٹھا، قرآن مجید بھی اسی ترقی کا شاہد ہے:

كَمۡ تَـرَكُـوۡا مِـنۡ جَنّٰـاتٍ وَّ عُيُوۡنٍ	کتنے ہی باغ اور چشمے، کھیت اور محل تھے، جو وہ
وَّزُرُوۡعٍ وَّ مَقَـامٍ كَرِيۡمٍ وَنَعۡمَةٍ كَانُوۡا	چھوڑ گئے ، کتنے ہی عیش کے سروسامان جن
فِيۡهَا فَاكِهِيۡنَ كَذٰلِكَ وَاَوۡرَثۡنَاهَا قَوۡمًا	میں وہ مزے کر رہے تھے، دھرے رہ گئے ، یہ
آخَـرِيۡـنَ فَـمَا بَكَتۡ عَلَيۡهِمُ السَّمَآءُ	ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان کا
وَالۡاَرۡضُ وَمَا كَانُوۡا مُنۡظَرِيۡنَ	وارث بنادیا ، پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین
(سورہ دخان:۲۶-۲۵)	اور ذراسی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔

قدیم فرعونی مصری تہذیب: فرعونی مصری تہذیب معروف ہونے کے باوجود پوری طرح بے نقاب نہیں تھی اور سوائے چند ظاہری آثار کے (جن میں سے اکثر ''الجیزہ'' اور ''الاقصر''، ''الاسوان'' کے ریگستانی علاقے میں ریت سے ڈھکے تھے جیسے: اہرام، ابوالہول وغیرہ) ان کے بارے میں واقفیت گویا نہیں تھی یہاں تک کہ فرانسیسی سائنس داں ''جان فرانسوا شامبلیون'' مصری زبان کے رموز واشارات کو ''الرشید'' نام کے پتھر کی مدد سے سمجھنے میں کامیاب ہوگیا جس کا انکشاف مصر پر فرانسیسی حملے کے دوران ہوا۔جس پر ایک تحریر دو زبانوں اور تین خطوط میں تھی، ایک مصری قدیم زبان دو خطوط میں تھی (۱) الهیر وغلیفیۃ جو مقدس خط کے نام سے پہچانا جاتا تھا (۲)۔الدیموطیقیۃ جو عام رسم خط تھا۔ جان فرانسوان زبانوں اور یونانی زبان کے تقابل سے ہیر و بعض ایسے اسرار پانے میں کامیاب ہوا جس کی وجہ سے مصر کے فرعونی آثار قدیمہ کو تلاش کرنے اور اس دور کی حیات وتہذیب کو سمجھنے کا ایک دروازہ کھل گیا۔

فرعون کا مفہوم اور اس کی شروعات: قدیم مصری زبان میں فرعون بڑے گھر کو کہتے تھے، پھر یہ حکام کے لقب کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ ۱۵۳۹ قبل عیسوی میں امنحوتب خامس (اخناتون) کو زندگی، خوشحالی اور صحت کے فرعون کے لقب سے مخاطب کیا گیا۔

(Encyclopadia of Britanica 9/355)

حکام مصر کے لیے الملک کا استعمال: تاریخی مراجع کے مطابق فرعون کا لقب حکام مصر کے لیے اٹھارہویں خاندان کی ابتداء سے استعمال کیا گیا۔ یعنی اس سے پہلے حکام مصر کے لیے بادشاہ کا لقب ہی مستعمل تھا۔ چاہے وہ ہکسوس (جس کے معنی قدیم مصری زبان میں ذمہ دار بادشاہ کے ہیں) (۱۶۶۸-۱۵۴۰) ہو یا اس سے پہلے کوئی اور۔

عجائب مصر: مصری باشندے متعدد دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ مثلاً آریس (موت کا دیوتا) یا آٹم (سورج دیوتا)۔ وہ موت کے بعد زندگی پر یقین رکھتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ لاش کی حالت جتنی اچھی ہوگی، مرنے والے کی روح دوسری دنیا میں اتنی ہی سکون سے رہ سکے گی۔ اسی لیے انہوں نے لاش کو محفوظ (حنوط) کرنے کا وہ طریقہ ایجاد کیا ممیوں کی شکل میں یہ ان کا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لیے مردے کے جسم سے گردے، پھیپڑے اور معدہ وغیرہ نکال کر جسم کو دوبارہ سی دیا جاتا اور بعض مسالوں سے خشک کیا جاتا۔ پھر کپڑے کی پٹیوں میں لپیٹ کر تابوت میں رکھ دیا جاتا۔ قبر میں تابوت کے ساتھ کھانے پینے اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی رکھی جاتیں کہ مرنے کے بعد کی دنیا میں مردے کو ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ ان کے تابوت کی شکل مرنے والے شخص جیسی یا کسی دیوتا جیسی ہوتی۔

بادشاہوں کے مقبرے عالی شان اور خوبصورت ہوتے، گنبد پر دیوتاؤں کی تصویریں اور دیواروں پر تصویروں کے ذریعہ مرنے والوں کی زندگی کے اہم واقعات بتائے جاتے۔ بادشاہ کی لاش پر قیمتی دھاتوں سے بنا ایک ہم شکل مرقع ہوتا جس سے دیکھنے والوں کو ان کی شکل اور اس زمانے کے پہننے، اوڑھنے کے رسم و رواج کا اندازہ ہو جائے۔ بادشاہوں کے مقبرے میں رکھی جانے والی چیزیں بھی بہت بیش قیمت ہوتیں۔ اب دریافت شدہ اکثر مقبروں سے یہ نادر اشیاء غائب ہیں لیکن چوروں سے بالکل محفوظ ایک مقبرہ ۱۹۲۲ء میں برطانوی ماہر آثار قدیمہ ہاورڈ

کارٹر نے دریافت کیا جو ایک نوجوان بادشاہ توتان خامون کا ہے۔ کپڑے کی پٹیوں میں لپٹے اس بادشاہ کو تین تابوتوں میں رکھ کر دفنایا گیا تھا۔

اہرام مصر: مصر کا اہرام عجائب عالم سے ہے، یہ قدیم زمانے کی انجینئرنگ کا شاہکار ہے۔ اس کی دیواریں غیر مسطح ہیں، بڑے بڑے چوکور پتھر ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر گارے وغیرہ سے جوڑے گئے ہیں، پتھروں کی ہر قطار اپنی نچلی قطار سے اندر کی جانب اور چھوٹی ہے، اس طرح اوپر جا کر یہ عمارت ایک مخروط (Pyramid) کی صورت اختیار کرگئی ہے۔ اس کی دیواروں پر منقش تصویریں صرف خوبصورتی کے لیے ہی نہیں تھیں بلکہ ان کے ذریعہ ایک خاص پیغام دیا جاتا تھا۔

ایک بڑا اہرام، بادشاہ خوفو (۲۵۵۰ ق م) کا ہے۔ اس مقبرے کی تعمیر میں بیس سال کا عرصہ لگا، ایک اندازے کے مطابق اس میں پتھر کے بیس لاکھ بلاک کام آئے، جن کا اوسط وزن اڑھائی ٹن فی بلاک تھا، ان میں سب سے بڑے بلاک کا وزن نوٹن کے قریب تھا۔

خوفو کے بیٹے خضری اور مینکارس کے اہرام کے علاوہ ۵۴ اور چھوٹے اہرام ہیں، ان اہرام کی تعمیر کے لیے دریائے نیل کا استعمال کیا گیا، جب نیل میں طغیانی آتی تو پانی پھیل کر اہرام کے علاقے تک جا پہنچتا، اس سے مال واسباب یہاں پہنچانے میں آسانی ہوتی۔

۵۰۰ قبل مسیح میں مشہور یونانی تاریخ داں ہیروڈوٹس نے اپنے سفرنامے میں لکھا کہ ان اہرام کی تعمیر میں ایک لاکھ سے زیادہ افراد نے کام کیا۔ ہیروڈوٹس نے یہ سفر اہرام کی تعمیر کے دو ہزار سال بعد کیا تھا، جدید ماہرین مصریات کے مطابق یہ تعداد ۲۰ ہزار کے قریب رہی ہوگی۔

ابوالہول: اہرام جیزہ کے مشرق میں ابوالہول ہے جو قوت و جبروت کی علامت ہے۔ ابوالہول یا اسفنکس (Sphinx) ایک ہی پتھر سے بنا ہوا دنیا کا سب سے بڑا مجسمہ ہے، یہ ۱۸۵ فٹ لمبا، ۲۰ فٹ چوڑا اور ۶۵ فٹ بلند ہے، اس کا جسم شیر کا لیکن چہرہ انسان کا ہے، یہ سورج دیوتا کے مظہر کے طور پر بنایا گیا تھا۔ اس دور میں سورج کو شیر سے تشبیہ دی جاتی تھی، یہاں مندروں کے آثار بھی ہیں۔ قریب میں کثیر تعداد میں کمروں کی ایک قلعہ نما عمارت ہے، یہ شہزادوں کے رہنے کے کمرے تھے۔

مصر کی قدیم تاریخ: مصر کی سات ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم تاریخ جتنی طویل ہے اتنی ہی دلچسپ بھی۔ بائبل کے مطابق مصر کو حضرت نوحؑ کے ایک پوتے نے اپنے نام پر آباد کیا۔

ان کی اولاد اس علاقے میں آباد ہوئی اور بائبل کے عہد تک وہی حکمراں رہی۔

بارہ ہزار برس قبل مصریوں نے غلہ پیسنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ زراعت کے بعد پتھر کے اوزار کا آغاز ہوا۔ دس ہزار برس قبل یہاں شمالی افریقی قبائل آباد ہوئے، آٹھ ہزار سال قبل یہاں گلہ بانی اور عمارتوں کی تعمیر کا سراغ ملتا ہے، ۳۱۰۰ قبل مسیح میں خاندانی بادشاہت کا آغاز ہوا۔ یہ بادشاہت پورے زرعی علاقے پر محیط تھی۔ قریب اکتیس خاندان اس بادشاہت سے متعلق رہے۔ ۳۳۰ قبل مسیح میں اسکندر اعظم نے مصر فتح کرکے اس سلسلے کو ختم کردیا۔

اکتیس خاندانوں میں تیسرے سے چھٹے خاندان تک کا زمانہ "قدیم سلطنت" (Kingdom Old) کہلاتا ہے۔ اسی دور میں لاشوں کو محفوظ کرکے ممیاں بنانے کا آغاز ہوا۔ اس وقت دارالحکومت ممفس تھا جو موجودہ جیزہ کے علاقے میں واقع تھا۔ ۲۵۷۵ قبل مسیح میں موجودہ بڑا اہرام، فرعون خوفو کے دور میں تعمیر کیا گیا۔ چھٹے خاندان کے فرعون پیپی کے دور میں مصر کو عروج حاصل ہوا۔

بعد کے پانچ سو سال طوائف الملوکی کے تھے جس میں پانچ مختلف خاندانوں نے حکومت کی۔ ۲۰۵۵ قبل مسیح میں منتوحوتب دوئم نے اس انتشار کا خاتمہ کرکے ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی جو درمیانی سلطنت (Kingdom Middle) کہلاتی ہے۔ یہ سلطنت آمن ام ہات سوئم نامی فرعون کے زمانے میں اپنے عروج کو پہنچی۔

ہکسوس بادشاہ: انیسویں صدی قبل مسیح میں سامی النسل ہکسوس بادشاہوں نے مصر فتح کرلیا، جب حضرت یوسفؑ یہاں آئے تو ان ہی کی حکومت تھی۔ ان کے دور میں بنی اسرائیل کو آباد ہونے کا موقع ملا۔ کچھ عرصے بعد اس حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی اور ہکسوس بادشاہت کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ لوگ پندرہویں اور سولہویں خاندان پر مشتمل تھے۔ اسی دور میں بنی اسرائیل کو غلام بنایا گیا۔

سترہویں خاندان کے دور میں دارالحکومت کو ممفس سے تھیپس منتقل کیا گیا۔ تھیپس عین اس مقام پر واقع تھا جہاں آج لکسر شہر موجود ہے۔ یہ توتن خامون کا دور تھا۔ کچھ عرصے بعد مصر میں اخناتون نامی فرعون ہوا جس نے بے شمار دیوتاؤں کی بجائے ایک خدا کی عبادت کو فروغ دیا۔ اخناتون کے بعد دیوتاؤں کی پھر کثرت ہوگئی۔

اخناتون کے بعد رعمسیس دوئم کے دور میں حضرت موسیٰؑ کی بعثت ہوئی اور آپ نے بنی

اسرائیل کو ان سے آزاد کروایا۔ رعمسیس کا بیٹا فرعون منفتاح سمندر میں غرق ہوا جس کی لاش بعد میں ملی اور اس کی ممی بنائی گئی۔

بعد کا دور جدید سلطنت (Kingdom New) کا دور ہے۔ اس میں مختلف خاندان اقتدار میں آئے۔ ایران اور یونان کی سلطنتوں کے حملے بھی ہوتے رہے۔ بالآخر اکتیسویں ہخامنشی خاندان کے عہد میں اسکندر اعظم نے مصر کو فتح کرکے خاندانی بادشاہت کے دور کا خاتمہ کردیا اور اپنے نام سے اسکندرہ کا شہر بسا کر مصر کا دارالحکومت قرار دیا۔

۳۲۳ قبل مسیح میں بابل میں اسکندر کی موت کے بعد اس کے ایک جنرل پٹولمی اول کے حصے میں مصر آیا، اس نے بھی فرعون کا لقب اختیار کیا اس کا خاندان تین سو سال حاکم رہا۔ خاندان کی آخری ملکہ قلوپطرہ تھی جس نے روم کے بادشاہ سیزر سے شادی کرلی۔

رومی دور: رومی سلطنت قائم ہوئی تو تیسری صدی میں رومی بادشاہ قسطنطین کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد یہ علاقہ عیسا مبلغین کا گڑھ بن گیا اور اکثریت نے بت پرستی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرلی۔ بے شمار خانقاہیں اور گرجے تعمیر کیے گئے۔ رسول اللہؐ کے دور میں خسرو نے مصر کو فتح کرلیا لیکن کچھ ہی عرصے بعد ہرقل نے مصر کو دوبارہ فتح کرکے بازنطینی سلطنت کا حصہ بنادیا۔

مسلمانوں کا دور: حضورؐ نے مصر کے گورنر مقوقس کو خط لکھ کر اسلام لانے کی دعوت دی جسے اس نے سنجیدگی سے سنا لیکن اسلام قبول نہ کیا۔ ۶۳۹ء میں حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کی قیادت میں ایک لشکر مصر بھیجا، جس نے صرف ڈیڑھ سال کے عرصے میں ہی سینا سے لے کر اسکندریہ تک کو اسلامی علم کے سایہ میں لادیا۔

حضرت عثمانؓ کے دور میں حضرت عبداللہ بن ابی سرحؓ مصر کے گورنر مقرر ہوئے۔ انہوں نے لیبیا، تونس، الجزائر اور مراکش کے علاقوں کو فتح کرلیا۔ کچھ ہی عرصے بعد مسلمانوں نے بحیرہ روم پار کرکے اسپین بھی فتح کرلیا۔ اس تمام عرصہ میں مصر خلافت اسلامیہ میں ایک صوبہ بنا رہا۔

خلافت عباسیہ کمزور ہوئی تو مصر میں طولونی اور پھر اخشید بادشاہوں کی حکومت قائم ہوئی۔ یہ لوگ عباسی بادشاہ کو خلیفہ مان کر اس کا نام خطبوں میں لیتے لیکن کاروبار سلطنت اپنی مرضی سے چلاتے، گویا اس حکومت میں عباسی خلیفہ کا اقتدار برائے نام تھا۔ ۹۷۱ء میں تونس کے فاطمی بادشاہوں کی حکومت

آئی جو اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ فاطمیوں نے قاہرہ کی بنیاد رکھی اور اسے اپنا دارالحکومت بنایا۔ انہوں نے ایک سو سال حکومت کی جس کے بعد ملک طوائف الملو کی کا شکار ہوگیا۔ سو سال کے بعد صلاح الدین ایوبیؒ نے ۱۱۸۳ء میں مصر کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے اسے اپنا مرکز بنایا۔

ایوبیؒ باصلاحیت نہ تھے۔ ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہوا جو اورنگ زیب عالم گیرؒ کے جانشینوں کے ساتھ ہوا تھا۔ بھائیوں میں اقتدار کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ ایوبی سلطنت ختم ہوئی اور حکومت ان غلاموں کو ملی جو مملوک سلاطین کہلائے۔ ان کی حکومت ۱۵۱۷ء تک رہی جب عثمانی بادشاہ سالم اول نے مصر فتح کر کے اسے سلطنت عثمانیہ کا حصہ بنا دیا۔

مصر کی جدید تاریخ: عثمانی خلافت کا انقطاع اس وقت عمل میں آیا جب ۱۷۹۸ء میں نپولین کی قیادت میں فرانس کا قبضہ ہوا، ۱۸۰۵ء میں محمد علی پاشا نے فرانسیسی حکومت ختم کر کے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی۔ محمد علی کی حیثیت عثمانیوں کے گورنر کی تھی۔ ان کے جانشینوں نے انگریزوں سے تعلقات بڑھائے اور ۱۸۶۹ء میں نہر سوئیز کھودی گئی۔ ۱۸۸۲ء میں برطانیہ نے مداخلت کی اور ۲۲-۱۹۱۴ء میں اس کو اپنی ماتحت مملکت (پروٹیکٹوریٹ) بنا کر رکھا۔

۱۹۲۲ء میں مصر آزاد ہوا اور مغرب پسند بادشاہ تخت حکومت پر بیٹھے۔ ۱۹۳۶ء کے معاہدہ نے مصر کی خودمختاری کو استحکام بخشا۔ جب ۱۹۴۸ء میں برطانیہ اور یورپ نے سرزمین عرب کے قلب میں ایک یہودی صہیونی مملکت اسرائیل کے نام سے قائم کی۔ ۱۹۵۲ میں ایک فوجی بغاوت کے نتیجے میں جمال عبدالناصر نے شاہ فاروق کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس وقت سے مصر میں فوجی حکومت کا آغاز ہوا جو فروری سال ۲۰۱۱ء میں حسنی مبارک کے زوال تک جاری رہی۔

دریائے نیل: دریائے نیل دنیا کا سب سے بڑا دریا ہے، یہ چار ہزار میل کا سفر طے کرتا ہے اور جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہے، جب کہ دنیا کے دوسرے دریا شمال سے جنوب کی طرف بہتے ہیں۔ یہ دریا قاہرہ کے وسط سے گزرتا ہے۔ اس کے دونوں طرف شہر آباد ہے، تھوڑے فاصلے پر خوبصورت پل ہیں جو شہر کے دونوں حصوں کو ملاتے ہیں، ان پلوں کے نیچے سے چھوٹے جہاز گزرتے ہیں۔ شہر سے باہر نکلنے کے بعد دریا کا پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا ہے۔ ہزاروں سال سے بہتے نیل نہ جانے کتنی تہذیبوں کی آبیاری کی ہے اور تہذیب کے نہ جانے کتنے سفینے اپنے سینے میں سمو لیے ہیں۔

جانور: ''اونٹ'' یہاں کا خاص مویشی ہے، بکریاں، بھیڑیں اور متعدد دوسرے جانور بھی ہیں، صحرائی جھاڑیوں میں بندر کی کچھ نسلیں بھی نظر آجاتی ہیں لیکن بہت کم پہاڑی بھیڑیں اور پہاڑی بکریاں بھی کہیں کہیں ہیں اور جہاں کہیں میسر پانی سے ڈیم بنالیے گئے ہیں وہاں بڑی نسل کی مچھلیاں اور مگرمچھ بھی ہیں۔

زبان: عربی مصر کی عام اور سرکاری زبان ہے۔ ''کوپٹک'' (Coptic) اسلام سے پہلے مصر کی کوپٹک (قبطی) زبان، مذہبی زبان تھی لیکن عربی زبان کے آنے کے بعد یہ زبان اپنا وجود کھو بیٹھی اور اب یہ صرف یادگار کے طور پر جانی جاتی ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی زبان بھی کہیں کہیں بولی سمجھی جاتی ہے۔

مصر کی جغرافیائی حالت: مصر براعظم افریقہ کے شمال مشرقی کونے میں سوڈان کے جنوب میں واقع ہے، مغرب میں لیبیا اور شمال مشرق میں اسرائیلی ریاست اور غزہ پٹی ہے، باقی دونوں سمتوں میں بحیرۂ روم اور بحیرۂ احمر کے ساحل ہیں، مشرق میں چھوٹے بڑے پہاڑوں اور دریائے نیل کے متصل ویران، سنسان اور بنجر زمین ہے۔ وادی نیل جہاں زیادہ آبادیاں ہیں ۵۰۰ میل تک پھیلی ہوئی ہے، ملک کا طول البلد ۳۰ جب کہ عرض البلد ۲۷ ہے۔ کل رقبہ ساڑھے اڑتیس ہزار مربع میل کے لگ بھگ ہے، خشکی ۹۹۵۴۵۰ مربع کیلومیٹر اور پانی ۶۰۰۰ مربع کیلومیٹر ہے، یہاں کے سب سے بڑے شہر اور دارالحکومت قاہرہ میں تقریباً ایک کروڑ ساڑھے آٹھ لاکھ کی آبادی ہے جب کہ دوسرے بڑے شہر اسکندریہ کی آبادی ۴۵ لاکھ ہے۔ مصر بنیادی طور پر چار بڑے بڑے خطوں پر مشتمل ہے یعنی وادی نیل، مشرقی صحرا، مغربی اور صحرائے سینا۔

مصر براعظم افریقہ کے اگرچہ ایک کونے میں واقع ہے لیکن خشک موسم یہاں کی تقدیر میں بھی ہے، سال بھر سورج چمکتا ہے اور بہت کم بارش ہوتی ہے، سمندر کے پڑوس کے باعث بہت زیادہ گرمی تو نہیں پڑتی لیکن ریگستانوں کی کثرت کی وجہ سے صحرائی طوفان آتے رہتے ہیں، جہاں بارش کے چھینٹے پڑ جاتے ہیں، وہی حصہ سبز دکھائی دیتا ہے۔ یہاں ٹھنڈک معتدل پڑتی ہے، قحط، زلزلہ، طوفان اور سیلاب جیسے قدرتی خطرات کے بادل یہاں کے لوگوں کے سروں پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ زرعی اراضی کا کم ہونا اور جنگلوں کی کٹائی وغیرہ امور ماحولیاتی مسائل کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

اقتصادی نظام: ۱۹۷۱ء کے دستور کے مطابق مصر کی معیشت کو اشتراکی رنگ میں رنگ دیا گیا تھا، جس کے نتیجے میں پیداواری ذرائع حکومت کی ملکیت میں آگئے، بینک، بیرونی تجارت،

روئی کی تجارت، روئی کی برآمدات اور ذرائع مواصلات وغیرہ سب حکومت کے زیر انتظام ہیں، نجی تحویل میں اگر کچھ ادارے ہیں تو مسلسل حوصلہ شکنی سے انہیں ختم کر دیا جاتا ہے یا پھر حکومت اپنی تحویل میں لے لیتی ہے، زمین کی ذاتی ملکیت کے بارے میں حکومت بہت سخت پالیسی پر کاربند ہے، زراعت کا کردار بہت اہم ہے، اکثریت زراعت سے وابستہ ہے، روزگار اسی سے ہے، غذائی ضروریات اور بیرونی زرمبادلہ اسی کے توسط سے حاصل کیا جاتا ہے۔

مصر میں زمین کا کوئی حصہ بنجر اور بے کاشت نظر نہیں آتا۔ مصر کی روئی دنیا بھر میں مشہور ہے اور نیل کے کنارے کنارے کھیتوں میں کپاس کے پھولوں کی نقرئی چمک دامان نظر کو کھینچتی ہے۔ پھلوں اور میووں کی پیداوار بہت ہے، آم، امرود، سنترے، انگور اور انجیر کے باغات بہ کثرت ہیں۔ زراعت کے بعد آمدنی کا بڑا ذریعہ سیاحت ہے۔ دنیا بھر کے سیاح ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔

کپاس، مکئی، چاول، گندم، جوار، گنا، ٹماٹر، کھٹے پھل، پھلیاں، سبزیاں، دالیں یہاں کی کاشت کو سرسبز بناتی ہیں۔ کرنسی پونڈ ہے۔ اسکندریہ، پورٹ سعید، سوئز اور دایتیا یہاں کی اہم بندرگاہیں ہیں۔

مصر کے قدرتی وسائل پٹرول، قدرتی گیس، آئرن اور فاسفیٹ، میگنیز، چونا، جپسم (کھریا مٹی) سیسہ، جست اور مویشی وغیرہ ہیں۔ قابل کاشت زمین ۳۴۲۲۰ مربع کیلومیٹر ہے۔

صنعتی نظام: مصر نے گذشتہ کچھ عرصے میں صنعتی ترقی میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا ہے، روئی اور کپڑوں سے متعلق کارخانے اور اسٹیل ملز یہاں کی بڑی بڑی صنعتیں ہیں۔ مصر نے خوراک اور غذائی اشیاء کی تیاری کے میدان میں بھی صنعتیں قائم کی ہیں، بڑی بڑی آئل ریفائنریز مصر کی انڈسٹری میں اہم مقام رکھتی ہیں، ان میں سے دو تو صرف نہر سوئز میں قائم ہیں، ۱۹۷۷ء میں مصر کی پائپ لائن کا بھی افتتاح ہوا جو بحیرۂ روم کے راستے نہر سوئز اور مشرق وسطی کو ملاتی ہے۔

۲۰۰۹ء میں امریکہ، اٹلی، اسپین، ہندوستان، سعودی عرب، شام، فرانس اور جنوبی کوریا کے ساتھ ۲۳٫۹ بلین ڈالر برآمدات اور ۵۶٫۴۵ بلین ڈالر کی درآمدات ہوئیں۔

الاخوان المسلمون کے بانی سید حسن البنا شہید کے اکلوتے بیٹے سیف الاسلام اخوان کی قیادت میں بہت اہم مقام رکھتے ہیں، مصری پارلیمان کے رکن بھی رہ چکے ہیں اور وکلاء کی یونین بار ایسوسی ایشن کے سکریٹری جنرل بھی منتخب ہوتے رہے ہیں۔ کویت کے رسالہ المجتمع کے نمائندے

بدر محمد بدر کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ ''مصر کے بارے میں مشہور کیا گیا ہے کہ یہاں غربت ہے، یہ بات بالکل جھوٹ ہے، مصر غریب ملک نہیں، اس میں اللہ نے ہر قسم کی دولت فراہم کی ہے، نہ یہ مادی لحاظ سے تہی دامن ہے نہ جوہر قابل کی کوئی کمی ہے۔ ہمارے علماء، سائنس داں، محققین اور ماہرین عالمی شہرت کے حامل ہیں لیکن ہماری ثروت لوٹ کر بیرون ملک منتقل کردی گئی ہے''۔

تعلیمی نظام: تعلیم کا مقصد طلبہ کو زندگی کی تعمیر و تشکیل، تعلیم کے اعلیٰ مراحل میں شراکت اور گراں قدر خدمات کے ساتھ اختراعی پیشوں کے لیے تیار کرنا ہے۔ تعلیم کے میدان میں ملک کی پالیسی یہ ہے کہ تعلیمی نظام کی صلاحیت کو مساوی مواقع فراہم کیے جائیں، تعلیمی منصوبہ بندیوں کو افرادی قوت کی ضروریات کے مطابق متوازن بنایا جائے، تعلیمی معیار بلند کرنے اور تعلیمی خدمات کے منصوبوں کو روبہ عمل لانے میں حکومت کے اقدامات کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

تعلیمی انتظام و انصرام کی ذمہ دار وزارت تعلیم ہے۔ اس کے تحت مختلف شعبہ جات اور ہایر یونیورسٹی کونسل ہیں، الازہر کی خود اپنی کونسل ہے جس کے تحت اس کا سارا نظام چلتا ہے۔ عوامی تعلیم کا انصرام اساسی قانون کے تحت ہے۔

پری ہائیر ایجوکیشن: پری ہائیر ایجوکیشن کے پہلے مرحلے میں لازمی تعلیم کی مدت چھ سے چودہ سال ہے جس میں پرائمری اسکول کا دورانیہ پانچ سال اور عمر چھ سے گیارہ سال ہے۔ اس میں پرائمری اسکول سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ پری پیریٹری اسکول کا ہے، اس کا دورانیہ تین سال اور عمر گیارہ سے چودہ سال ہے، تکمیل کے بعد طالب علم کو بیسک ایجوکیشن کمپلیشن سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے۔ تیسرا مرحلہ جنرل سکنڈری اسکول کا ہے، اس کی مدت تین سال اور عمر چودہ سے سترہ سال ہے، کورس کے اختتام پر طالب علم جنرل سکنڈری ایجوکیشن سرٹیفکٹ کا حقدار ہوجاتا ہے۔ اسی اسکول کا ایک مرحلہ ٹیکنکل سکنڈری اسکول ہے، اس کی مدت تین سال اور عمر کی تحدید چودہ سے سترہ سال ہے، اس میں ٹیکنکل ایجوکیشن ڈپلومہ کی ڈگری ملتی ہے۔ اعلیٰ سطح کے لیے ٹیکنکل سکنڈری اسکول ہے، اس کی مدت پانچ سال اور عمر چودہ سے انیس سال ہے، اس کے بعد اڈوانسڈ ٹیکنکل ڈپلومہ مل جاتا ہے۔ تکنیکی تعلیم حاصل کرنے کے دوران طالب علم تجرباتی ولسانی وجسمانی تعلیم سے بھی آراستہ کیا جاتا ہے۔

ان مراحل سے ۷۵ فیصد نمبروں کے حصول کے بعد ہی طالب علم یونیورسٹی سطح کی تعلیم حاصل

کرسکتا ہے، البتہ ۱۹۹۱ء سے تکنیکی مدارس کے بعض فارغین کو بھی اعلیٰ تعلیم میں داخلے کی اجازت دی گئی ہے۔

پرائمری اور پری پیریٹری (چھ سے پندرہ سال کی عمر تک) دونوں سطحوں کی تعلیم کو ابتدائی تعلیم میں شامل کر کے ۱۹۸۱ء میں مفت لازمی تعلیم کے قانون کو وسعت دی گئی۔

ہائیر ایجوکیشن: مصر میں اعلیٰ تعلیم قریب بیس یونیورسٹیوں اور سرکاری /خانگی پیشہ ورانہ اور تکنیکی تربیت کے اعلی اداروں کے ذریعہ فراہم کی جاتی ہے، اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داری منسٹری آف ہائیر ایجوکیشن اینڈ سائنٹفک ریسرچ کی ہے۔ تعلیمی انتظامات وقوانین، صدارتی فرمان اور حکومت کے اصول وضوابط کے توسط سے متعین کیے جاتے ہیں، ریاستی جامعات سپریم کونسل آف یونیورسٹیز کے زیر تسلط ہیں، مصری جامعات تعلیمی اور انتظامی لحاظ سے خودمختار ہیں۔ ان میں سائنٹفک ریسرچ کا بہترین انتظام ہے۔ تکنیکی اور پیشہ ورانہ تربیت کے اعلیٰ اداروں کے اسناد یونیورسٹی کے اسناد کے مماثل ہوتے ہیں۔ فاصلاتی تعلیم ۱۹۹۱ء میں قاہرہ، اسکندریہ اور اسیوط کی یونیورسٹیوں میں متعارف کی گئی۔ خانگی جامعات داخلوں اور فیس کی تعیین کے معاملات میں منسٹری کی جانب سے بغیر کسی مداخلت کے اپنے اصول وضوابط نافذ کرنے کی مجاز ہیں۔

یونیورسٹی کے عام نصاب کے لیے عربی زبان لازمی ہے۔ امریکن یونیورسٹی قاہرہ اور ہیلوان یونیورسٹی کے بعض شعبوں اور اسکندریہ یونیورسٹی کے شعبہ زراعت میں ذریعہ تعلیم انگریزی زبان ہے، جبکہ سنگھور یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم فرانسیسی (فرنچ) ہے۔ تعلیم بالغان کی شرح ۵۷ فیصد ہے، بیس ہزار پرائمری اور سکنڈری اسکول میں لگ بھگ دس ملین طلبہ زیر تعلیم ہیں۔

اعلیٰ تعلیمی نظام ۲ء۴ ملین سے زائد طلبہ پر مشتمل ۱۸ عوامی جامعات، ۱۲ غیر جامعاتی عوامی ادارے اور منفعت کی بنیاد پر پیشہ ورانہ اور تکنیکی تربیت فراہم کرنے والے ۱۵ خانگی جامعات پر مبنی ہے۔ ۱۲ غیر جامعاتی اداروں میں سے ۸ ادارے دوسالہ اپر سکنڈری لیول ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹس (MTI) اور ۴ یا ۵ سالہ ہائیر ایجوکیشن لیول ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹس ہیں۔ علاوہ ازیں ۱۱۵ خانگی ادارے (منفعت پر مبنی) یکساں تعلیم فراہم کرتے ہیں۔

اس اعلیٰ تعلیمی نظام میں ترسٹھ ہزار سے زائد تدریسی عملہ برسر خدمت ہے۔

مصر میں اعلیٰ تعلیم کی ذمہ داریوں کے لیے تین محکمے ہیں۔ یعنی منسٹری آف ہائیر ایجوکیشن، سپریم کونسل آف یونیورسٹیز (SCU) اور سنٹرل ایڈمنسٹریشن آف الازہر انسٹی ٹیوٹس۔ منسٹری آف

ہائیر ایجوکیشن کو مابعد ثانویہ کی تعلیم ،منصوبہ بندی پر قطعی فیصلہ کا حق حاصل ہے۔ بنیادی تعلیم کے لیے اساتذہ کی تربیت کا معاملہ بھی وزارت برائے اعلیٰ تعلیم ہی دیکھتی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں قائم کردہ سپریم کونسل آف یونیورسٹیز ، جامعات میں سائنٹفک ریسرچ اور جامعاتی سطح کی تعلیم کی تمام پالیسیوں کو نافذ کرتی ہے۔ داخلہ کے متعلق تمام امور کا اسے قطعی حق حاصل ہے۔ الازہر کے انتظام کی ذمہ داری سنٹرل ایڈمنسٹریشن آف الازہر انسٹی ٹیوٹس پر ہے۔

صنعتی، تجارتی اور زراعتی جیسے تین مختلف میدانوں میں تکنیکی تعلیم تین سالہ اور پانچ سالہ پروگرام کے تحت دی جاتی ہے۔

۲۰۰۴ء میں ثانوی درجات کے تیس فیصد طلبہ نے پیشہ ورانہ کورسیز میں داخلہ لیا۔

الازہر نظام: عوامی تعلیمی نظام کے مساوی ومتوازی الازہر نظام ہے۔ اس میں طلبہ اور طالبات کے لیے الگ الگ مدارس ہیں۔ سپریم کونسل آف دی الازہر انسٹی ٹیوشنس اس نظام کی نگراں ہے۔ یہ رسمی طور پر وزارت تعلیم سے آزاد لیکن وزیراعظم کی زیرنگرانی ہے۔ الازہر مدارس، ''انسٹیٹیوٹس'' (Institutes) کے نام سے معروف ہیں، مذہبی موضوعات پورے نصاب میں شامل ہیں۔ اس نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے والے تمام طلبہ مسلم ہیں، اس میں مخلوط تعلیم نہیں۔ دیہی علاقوں میں خاص طور پر الازہر مدارس کی شاخیں ہیں۔ ۲۰۰۷ء اور ۲۰۰۸ء میں الازہر کے ۸۲۷۲ مدارس چل رہے تھے، ان مدارس کے فارغین ازہر یونیورسٹی میں ہی اعلیٰ تعلیم جاری رکھنے کے اہل ہیں۔

ان تمام انتظامات کے باوجود جدید سہولتوں کی کمی، تربیت یافتہ معلمین کی قلت سے تعلیم کا معیار زوال پذیر ہے اس کے لیے سماجی سطح پر کوئی بڑی کوشش بھی نظر نہیں آتی، صرف ایک تنظیم جمعیۃ معلّمی المناہج الدولیۃ نے سنجیدہ کوششیں کیں اور بڑی حد تک اس کو کامیابی بھی ملی۔

اعلیٰ تعلیم کا معیار، توقعات کے مطابق اگرچہ نہیں ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ تعلیم عام ہے، ہائی اسکول تک تعلیم لازمی اور مفت ہے، اس لیے کوئی ناخواندہ نہیں، عربی اخبارات اور عربی کتابیں پڑھنے کا شوق بے انتہاء ہے۔

جامع ازہر: جامع ازہر کے قرب وجوار میں گھنی آبادی ہے، جامعۃ الازہر کی ابتداء مسجد سے ہوئی جو جامع ازہر کہلاتی ہے۔ اس کی تعمیر ۳۶۱ھ میں فاطمی حکومت کے زمانے میں ہوئی۔

اس میں تین منارے ہیں اور وسیع وکشادہ صحن ہے۔ بیسویں صدی میں اسے باقاعدہ یونیورسٹی کی حیثیت دے دی گئی، اب اس کی کئی عمارتیں ہیں اور تعلیم جامع ازہر کے بجائے جامعۃ الازہر میں ہوتی ہے لیکن بعض شیوخ اب بھی مسجد میں درس دیتے ہیں اور یہ درس رواق عباس میں ہوتا ہے۔ اس طرح ازہر کی قدیم روایات اب بھی باقی ہیں۔ جامعۃ الازہر کے دوسرے شعبے مدینۃ النصر میں ہیں۔ جامعہ ازہر کی عظیم الشان لائبریری میں تقریباً ایک لاکھ کتابیں اور پندرہ ہزار مخطوطات ہیں۔ جامع ازہر کا اپنا میڈیکل کالج اور اسپتال بھی ہے۔

قاہرہ یونیورسٹی: قاہرہ یونیورسٹی ایک جدید یونیورسٹی ہے۔ اس میں کلیۃ الآداب، کلیۃ الآثار، کلیۃ الحقوق، کلیۃ العلوم، کلیۃ الاعلام اور دارالعلوم ہیں۔ دارالعلوم عربی زبان وادب کی خدمت کا بہت بڑا مرکز ہے، اس کا کتب خانہ بہت اچھا ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار طلبہ اس سے وابستہ ہیں۔ طالبات کی تعداد ۶۵ فیصد ہے۔

مصر مرکز علم وادب: مصر عالم عرب کا علمی اور ادبی دارالسلطنت ہے، یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کا سکہ عالم عربی میں رائج ہے، ان کی کثرت بھی قابل رشک ہے، مردوں کے ساتھ خواتین میں بھی ادب وتصنیف کا ذوق ہے۔ زندہ دلان مصر بھی ادبی ماحول کی جان ہیں اس ادبی رونق میں ہندوستانی رنگ بھی شامل ہے یعنی مولانا ابوالکلام آزاد سنٹر اور اس کا عربی رسالہ الشرق، اس کے مدیر محمد وفا حجازی اور ذمہ دار عبدالکریم ہیں۔ ادبی رسائل میں الادب والنقد کو وقار کا درجہ حاصل ہے، جدید ادبی نظریات بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

مجمع اللغۃ العربیۃ: یہ مصر کا سب سے قدیم اور مؤقر ترین ادارہ ہے جس نے بہترین علمی و تحقیقی کتابیں شائع کیں، ۱۸۹۲ء میں اس کا قیام عمل میں آیا، شیخ محمد عبدہ اور شیخ محمد شنقطی جیسے افاضل اس کے بنیادی رکن تھے۔ حفنی ناصف، شیخ خضری، احمد لطفی سید جیسے مشہور اہل قلم اس سے وابستہ رہے۔ شوقی ضیف عرصہ تک اس کے صدر رہے، ۱۹۳۲ء میں سرکاری حیثیت اختیار کرنے کے بعد یہ بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہوگیا، اس کے اراکین میں عالمی نام شامل ہوئے، مختلف علمی وتحقیقی منصوبوں جیسے معاجم ولغات کی تالیف اور بلند پایہ سمیناروں کا اہتمام شروع ہوا۔

(باقی)

اخبار علمیہ

''ایک دینی موبائل''

ایک خبر کے مطابق مسلمانوں کی مذہبی اور دینی ضرورتوں کے پیش نظر ایسا موبائل سیٹ منظر عام پر لایا گیا ہے جس میں دنیا کے سات مشہور قرائے کرام کی قرأت سنی جاسکتی ہے، اردو، عربی، انگریزی، ملیالم، مراٹھی، گجراتی سمیت ۲۹ زبانوں میں قرآن اور حدیث کی بعض مستند کتابوں اور دعاؤں کے ترجمے بھی اس میں محفوظ کیے گئے ہیں، جی پی آر ایس اور ایف ایم ریڈیو کی سہولت بھی فراہم کی گئی ہے، دوسم والے اپنی نوعیت کے اس پہلے موبائل سیٹ کی قیمت ۳۹۵۰ روپے ہے، ملیشیا کی این میک کمپنی نے اس کی تیاری میں خاص کردار ادا کیا ہے، خاص بات یہ ہے کہ اوقات نماز کے دوران یہ موبائل خود بخود ساکت ہوجاتا ہے۔

''یونان میں تعمیر مساجد کی اجازت''

یونان کے شہر ایتھنز میں پاکستان، بنگلہ دیش، شام، مراکش اور نائیجیریا سے تعلق رکھنے والے پچاس ہزار مسلمان بود و باش رکھتے ہیں، گذشتہ کئی برسوں سے یونان کی مقامی غیر مسلم کونسل اور ملک کی سب سے بڑی سیاسی جماعت لارس کی جانب سے مخالفت کے سبب وہاں تعمیر مساجد کی اجازت نہیں تھی، لیکن ایک خوش کن خبر ہے کہ مسلمانوں کی قانونی چارہ جوئی اور مسلسل جدوجہد نے بالآخر پارلیمنٹ کے ۲۱۴ ممبروں میں ۱۹۸ کی تائید وحمایت حاصل کرلی اور قیام مسجد کی منظوری مل گئی۔

''قزاقستان میں ادائے نماز پر پابندی''

قزاقستان سوویت یونین سے آزاد ہونے والی ریاستوں میں اہم مسلم ریاست ہے، خبر ہے کہ وہاں کے حکومتی اداروں اور سرکاری دفاتر میں نماز جمعہ اور دوسری عبادات کی ادائیگی پر پابندی کے بل کا مسودہ تیار کیا جاچکا ہے، اس تجویز کی قانونی منظوری کے بعد اس کی خلاف

ورزی پر خطیر جرمانہ اور سخت سزا کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

''مرد و خواتین کے دماغوں کا طرز فکر''

برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کے محققین کے جائزہ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ دنیا کا ہر پانچواں مرد ایک خاتون کی طرح سوچتا ہے اور ہر دسویں خاتون کا دماغ مردوں جیسی سوچ رکھتا ہے، ان کی تحقیق کے مطابق مردوں میں نسوانی دماغ کے متعدد دلائل میں ایک اہم دلیل فیشن کی جانب اس کا میلان اور عورتوں میں مردانہ ذہن و دماغ یا طرز فکر علم ریاضیات میں اس کی تجزیاتی صلاحیت کا پایا جانا ہے، ماہرین نے مردو کے دماغ کو تجزیاتی اور عورتوں کے دماغ کو تخلیقی کاموں کے وقت زیادہ متحرک پایا، اس تحقیق تازہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کی تعمیری شخصیت کا فیصلہ اس کی پیدائش سے قبل ہو چکا ہوتا ہے، اس سے لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیمی سمت کے تعین میں اساتذہ کو بلاشبہ مدد ملنے کا امکان ہے۔

''کمپیوٹر وائرس''

انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کے لیے یہ خبر یقیناً ضروری ہے کہ خاتون نما ''میمبٹ'' نامی وائرس کمپیوٹر کو خراب کرسکتا ہے، یہ وائرس فوری طور پر مخاطب کرتا ہے اور دوران تخاطب ہی کمپیوٹر کے کارگزار اعضاء یعنی کل پرزوں کو مفلوج کر دیتا ہے، یہ وائرس پہلی مرتبہ ۲۰۰۷ء میں سامنے آیا تھا، اسی سال ایک روسی کمپنی سائبرلور نے دعوی کیا تھا کہ اس نے ایک ایسا سافٹ ویئر تیار کرلیا ہے جو خود کو جنس مخالف کے طور پر ظاہر کرتا ہے اور انٹرنیٹ کا صارف وائرس کے دام میں اسیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس وائرس سے احتراز کی ضرورت زیادہ ہے۔

''دماغ پر خوشبو یا بدبو کے اثرات''

جرمنی کے محققین کے مطابق سوتے وقت جب کسی گلی سڑی چیز کا تعفن ناک میں داخل ہوتا ہے تو خواب میں منفی اور خراب اور خوشبو پہنچتی ہے تو اچھی چیزیں نظر آتی ہیں، ہائیڈن برگ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر بورس اسٹک کا بیان ہے کہ جب انہوں نے بدبو اور خوشبو خارج

کرنے والی چیزیں خوابیدہ شخص کو سنگھائیں اور بیداری کے بعد دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس عمل سے ان کے خوابوں کی جذباتی کیفیت پر اثر پڑا ہے، بدبو والے افراد کو بری اور بھیانک اور اچھی مہک والے افراد کو اچھی چیزیں نظر آئیں، اسی طرح آواز، ارتعاش اور دباؤ سے بھی خوابوں کی کیفیت بدلی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سونے والے کے ذہن و دماغ پر خوشبو یا بدبو اثر انداز ہوتی ہے۔

''فولاد کی کمی یادداشت میں کمی کا اہم سبب''

ورجینا یونیورسٹی کے ماہرین غذائی اشیا کے مطابق بکرے کا گوشت بشمول کلیجی بغیر چربی کا سرخ گوشت، جھینگے، ٹیونا، سارڈین وغیرہ اور پھلوں میں انجیر، خشک خوبانی، منقہ، سبزیوں میں پالک، بروکلی، ناشپاتی اور مسور کی دال میں فولاد زیادہ ہوتا ہے۔ امریکی طبی ماہرین کا بیان ہے کہ جن بچوں میں فولاد کی کمی ہوتی ہے ان میں یادداشت اور تدبر و تفکر کی صلاحیت کی بھی کمی ہوتی ہے اور تعلیم کے میدان میں بہتر کارکردگی کے مظاہرہ سے بھی وہ قاصر رہتے ہیں، انہوں نے ایک سال کے بچوں سے تجربہ کا آغاز کیا اور وقفہ وقفہ سے ان کی قوت حفظ اور تدبر و تعقل کی صلاحیتوں کا اندازہ کرتے رہے، تجربہ کے دوران معلوم ہوا کہ جن میں فولاد کی کمی تھی انہوں نے بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کیا۔

''نسیان کا مرض''

امریکا میں ۱۸ سے ۶۵ سال تک کے ایسے ۶۸۷ افراد کے مرض نسیان یا یادداشت کی کمزوری کا تجزیہ اور تجربہ کیا گیا، نتیجہ بڑا دلچسپ رہا، جو لوگ خواب دیکھنے کے بعد انہیں یاد رکھتے ہیں ان کی یادداشت خواب نہ یاد رکھنے والوں سے بہتر ہے اور جو خواب دیکھ کر فوراً بھول جاتے ہیں وہ زندگی کے عام معمولات میں غائب دماغی اور پراگندہ ذہن کے شکار ہیں، خوابوں کی جزئیات بیان کرنے والوں کی ذہنی سطح بھی ان سے بہتر پائی گئی۔

ک، ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

اخبار علمیہ میں نظریۂ آئن اسٹائن

شعبۂ فزکس،
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڈھ
۱۰/۱/۲۰۱۲ء

محترم مدیر معارف

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف بلاشبہ ایک انتہائی معیاری علمی رسالہ ہے۔ راقم نہایت پابندی سے اس کا مطالعہ شذرات سے لے کر رسید مطبوعہ کتب تک کرتا ہے۔ بعض مضامین دو دو تین تین بار پڑھے جاتے ہیں۔ میرے خیال میں معارف میں عام فہم سائنسی مضامین بھی شائع ہونے چاہیے۔ ماضی میں سائنسی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت کے موضوع پر معارف میں شائع شدہ صرف دو مضامین کا ذکر کرنا ہی کافی ہوگا۔

۱- معارف دسمبر ۱۹۲۲ء (ج ۱۰، ش ۶، ۱۹۲۲ء، ص ۴۲۷ تا ۴۳۸) میں جامعہ عثمانیہ کے پروفیسر نصیر الدین احمد کا طویل مضمون ''نظریہ اضافیت'' شائع ہوا تھا جسے کافی پسند کیا گیا تھا۔

۲- معارف اپریل ۱۹۴۱ء (ج ۴۷، ش ۴، ۱۹۴۱ء، ص ۲۶۵ تا ۲۸۵) کے شمارے میں ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان کا شہرۂ آفاق مضمون ''نظریہ اضافیت'' شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ڈاکٹر صاحب نے ۲/ مارچ ۱۹۴۱ء کو رضا اکیڈمی رام پور کے افتتاح کے موقع پر خطبۂ صدارت کے لیے لکھا تھا لیکن اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور ۱۳/ مارچ ۱۹۴۱ء کو وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کا یہ صدارتی خطبہ رضا اکیڈمی کے افتتاحی مجلس میں پڑھا گیا۔ معارف کے اسی شمارے میں پورے شذرات میں صرف سر شاہ سلیمان کی وفات کا ذکر ہے۔ شذرات کے اخیر میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے یہ لکھا

کہ ''مرحوم کی علمی زندگی کی اخیر یادگار کے طور پر یہ مضمون معارف میں شائع کیا جارہا ہے''۔

مندرجہ بالا دونوں مضامین کی فوٹو کاپی میرے پاس محفوظ ہے جو میں نے بنگلور کی جامع مسجد کی لائبریری سے ۲۰۰۰ء میں حاصل کی تھی۔ اب میں اصل موضوع کی طرف آرہا ہوں جس کی وجہ سے مجھے یہ خط لکھنا پڑا۔

محترم کلیم صفات اصلاحی صاحب اخبار علمیہ کے عنوان سے ہر ماہ پابندی کے ساتھ معارف کے قارئین کے لیے مختلف دلچسپ خبریں فراہم کرتے ہیں۔ راقم بہت دلچسپی کے ساتھ رسالہ ہاتھ میں لیتے ہی پہلے یہی حصہ پڑھتا ہے۔ اس کے لیے وہ محترم اصلاحی صاحب کا شکر گزار ہے اور ان کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

معارف دسمبر ۲۰۱۱ء کے شمارے میں انہوں نے صفحہ ۴۶۹ پر ''نظریہ آئن اسٹائن باطل'' کے عنوان سے ۹ سطروں میں دو مختلف موضوعات کا جن کا آپس میں کوئی ربط نہیں ایک ہی پیراگراف میں ذکر کر دیا ہے۔ اخیر کی چار سطور آئن اسٹائن کے دماغ کی نمائش سے متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو آئن اسٹائن کا نظریہ باطل قرار پایا ہے اور نیوٹرینو (Neutrino) کی دریافت تو ۱۹۵۶ء ہی میں ہو چکی ہے۔

راقم سائنس کا ادنی طالب علم ہے۔ پچھلے چالیس سالوں سے بنیادی ذراتی طبیعات (High Energy Particle Physics) کے میدان میں تحقیقی کام کر رہا ہے۔ تین درجن سے زائد تحقیقی مضامین مختلف بین الاقوامی سائنسی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ نیز ۱۹۷۸ء سے آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت (Special & Generel Theory of Reletirity) کا ایم۔ ایس سی درجات میں درس دینے کا بھی سلسلہ جاری ہے۔ اس موضوع پر راقم کے درجنوں عام فہم مضامین ملک کے مختلف رسائل واخبارات میں شائع ہو چکے ہیں اور کئی ریڈیائی تقاریر بھی اس موضوع پر نشر ہو چکی ہیں۔ اب میں مذکورہ بالا دونوں موضوعات کی وضاحت مختصراً عرض کرتا ہوں۔

۱- عظیم ترین سائنس داں البرٹ آئن اسٹائن نے ۱۹۰۵ء میں نظریہ اضافیت خاص (Special Theory of Reletirity) پیش کیا تھا جس کے تحت خلا میں روشنی کی جو رفتار ہے اس سے زیادہ رفتار کائنات میں کسی بھی چیز کی نہیں ہو سکتی۔ تین ماہ قبل یورپین آرگنائزیشن فار نیوکلیر

ریسرچ (CERN) کے سائنس دانوں نے دعوی کر کے ساری دنیا میں سنسنی پھیلا دی تھی کہ نیوٹرینو کی رفتار روشنی سے تیز ہے۔ حالانکہ اسی وقت یہ بھی کہا گیا تھا کہ آخری اعلان کرنے سے پہلے اگلے سال یعنی ۲۰۱۲ء میں اس تجربے کو دہرائیں گے۔ پھر اسی ہفتے روشنی کی رفتار سے تیز ذرات کی رفتار کی دریافت رد کر دی گئی اور یہ کہا گیا کہ نیوٹرینو میں اتنی توانائی ہی نہیں ہے کہ سوئزرلینڈ سے چھوڑی گئی نیوٹرینو شعاعیں بالکل اسی طرح اٹلی پہنچ جائیں۔ اتنا فاصلہ طے کرنے کے لیے جو توانائی درکار ہے نیوٹرینو کی شعاعیں اس کی اہلیت نہیں رکھتیں۔ دنیا بھر کے معروف سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے تجربے کے بعد آئن اسٹائن کی تحقیق کو صحیح ٹھہرایا اور اس کے ساتھ ہی روشنی سے تیز کوئی اور شے کو دریافت کر لینے کے دعوے خارج ہو گئے۔ بہرحال اتنا ضرور ہوا کہ دنیا کے دیگر حصوں میں بھی نیوٹرینو کی رفتار کا پتہ لگانے کے لیے آزادانہ طور پر تجربات کی شروعات ہو رہی ہے۔

نیوٹرینو ان بنیادی ذرات میں سے ایک ہے جن سے مل کر ایک ایٹم بنتا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں پالی (Pauli) نے اس کے لیے تھیوری دی اور مشہور سائنس داں فرمی (Enrico Fermi) نے پالی کے اس مفروضہ بنیادی ذرے کا نام نیوٹرینو رکھا۔ بہرحال اس کی دریافت کا سہرا فریڈرک (Frederick Reines) اور کووان (Cyle Cowan) کے سر ہے جنہوں نے ۱۹۵۶ء میں ایک تجربے کے دوران نیوٹرینو کو دریافت کیا۔ نیوٹرینو کی بھی تین اقسام ہیں۔ الکٹران ٹائپ، میویوان ٹائپ اور ٹاؤ ٹائپ (Electron, Muon and Tau Type neutrinos) آخری یعنی ٹاؤ نیوٹرینو ۱۹۷۵ء میں دریافت کیا گیا۔

روشنی سے تیز رفتار ذرے کی تلاش کی کہانی نصف صدی پرانی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں ایک ہندوستانی سائنس داں سدرشن (ECG Sudershan) نے اس مفروضی ذرے کا نام ٹیکیان (Tachyon) رکھا جو مشہور ناول نگار ویلس (H.G. Wells) کے شہرت یافتہ ناول ''ٹائم مشین'' سے لیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں اس مفروضہ ذرے کی تلاش جاری ہے۔ کئی بار اس کی دریافت کے دعوے بھی کیے گئے لیکن ابھی تک اس کے ٹھوس تجرباتی ثبوت ناپید ہیں۔

مندرجہ بالا وضاحت کی روشنی میں محترم اصلاحی صاحب کا یہ تحریر فرمانا کہ ''چند ماہ قبل یورپین محققین نے روشنی سے تیز رفتار ذرات نیوٹرینو کو دریافت کر کے اس (آئن اسٹائن) کے اس

خیال کے ابطال پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے‘‘۔ میرے خیال میں مناسب نہیں۔ حسن ظن کے طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ موصوف کو روشنی سے تیز رفتار ذرات کی دریافت کو رد کر دینے کا شاید علم نہیں ہوسکا۔ بہرحال نیوٹرینو کی دریافت کی بات کرنا تو کسی طرح مناسب نہیں۔

۲- انہیں سطور میں آئن اسٹائن کے دماغ کی نمائش کے سلسلے میں بھی لکھا گیا ہے جس کا آئن اسٹائن کے نظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی وضاحت کی جائے۔ دراصل آئن اسٹائن کا انتقال ۷۶ سال کی عمر میں ۱۸/اپریل ۱۹۵۵ء میں ہوا تھا۔ موت کے اسباب کا پتہ لگانے کے لیے ڈاکٹر ٹامس ہاروے نے ان کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ اس دوران ڈاکٹر نے ان کا دماغ بھی معائنہ کے لیے باہر نکالا مگر وہ اسے دوبارہ کھوپڑی کے اندر رکھنے میں ناکام رہے اور انہوں نے دماغ کو اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ ڈاکٹر ہاروے نے دعویٰ کیا تھا کہ آئن اسٹائن کے بیٹے نے انہیں دماغ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اگرچہ اس پر کھڑے ہونے والے تنازع میں ڈاکٹر ہاروے کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا مگر عظیم سائنس داں کا دماغ انہیں کی تحویل میں رہا۔

اس واقعہ کے کئی سال بعد ڈاکٹر ہاروے نے دماغ کے کچھ حصے مزید تحقیق کے لیے نیوروسائنس دانوں کو بھیجے تاکہ وہ یہ جائزہ لیں کہ دماغ کے کس حصے نے آئن اسٹائن کو بیسویں صدی کا ذہین ترین سائنس داں بنادیا۔ ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ ریاضی اور سوچ بچار سے متعلق دماغ کے حصے ایک نارمل دماغ کی بہ نسبت ۱۵ فیصد بڑے تھے نیز نیوران یعنی تمام دماغی امور انجام دینے والے خلیوں (Cells) کے گرد حفاظتی تہ بھی عام افراد کی بہ نسبت بڑی تھی۔ بیسویں صدی کے اس عظیم ترین سائنس داں کے دماغ کی پہلی نمائش امریکی شہر فلاڈلفیا میں ہوئی۔ اس نمائش میں دماغ کو چھ ٹکڑوں کی شکل میں سلائیڈوں پر پیش کیا گیا۔

محترم! میرا یہ خط کافی طویل ہوگیا۔ اس طول کلامی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ آپ مناسب سمجھیں تو یہ خط معارف میں شائع کردیں۔ مختصر کرنے کا فن آپ خوب جانتے ہیں۔

والسلام

ڈاکٹر عرفان احمد

وفیات

نواب رحمت اللہ خاں شروانی مرحوم

۱۰؍جنوری کی صبح علی گڑھ سے برادرم ڈاکٹر جمشید ندوی نے خبر دی کہ نواب رحمت اللہ خاں شروانی نے آخر شب قریب ساڑھے چار بجے داعی اجل کو لبیک کہا، انا للّٰه وانا الیه راجعون ۔

خودنمائیوں کی جستجو میں مصروف اس دنیا کو کیسے بتایا جائے کہ جانے والا کون تھا؟ کبھی ہمارے صاحب دل شاعر نے بزم دہلی کا نوحہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ع یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

افسوس اب علی گڑھ کی بزم دوشیں کی یہ یادگار بھی اٹھ گئی جس نے علم نوازی اور علم پروری کی ان روایات کو مدۃ العمر زندہ وتابندہ رکھا جن کا ذکر اب شاید ماضی کی داستانوں ہی میں ملتا ہے۔

نواب صاحب نے قریب بیاسی سال کی عمر پائی، ۱۶؍فروری ۲۹ء میں پیدا ہوئے، بھیکم پور کی ریاست گومملکت نہ تھی تاہم ۳۶۵ قریوں اور قصبات کی ملکیت، نوابی کے تمام معروف مظاہر کے لیے کم بھی نہیں، لیکن شروانی خاندان نے حکومت وسطوت کی ظاہری علامتوں سے بیزاری پر اپنی قدروں کی استواری کو ترجیح دی، عمل داری رہی تو علم وحلم اور جود وسخاوت کی، رحمت اللہ شروانی مرحوم کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی، تعلیم کے لیے وہ مشہور دون اسکول ضرور گئے لیکن صحت کی ناسازی کی وجہ سے یہ تعلیم تکمیل کے مراحل تک نہ پہنچ سکی، البتہ علم پرور ماحول نے ان کو علم شناسی کی ایسی دولت دی جس سے وہ ہمیشہ پرثروت رہے اور دوسروں کو بھی تونگر بناتے رہے، مال وزر کی جگہ بہترین کتابوں سے ان کا خزانہ بیش قیمت ہوتا رہا اور یہ دوسروں پر بھی نچھاور ہوتا گیا۔ ان کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سرسید کی گود میں کھیل کر جواں ہوئے تھے، قدرتاً رحمت اللہ صاحب کا شمار ان میں تھا جن کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ کے زمین وآسمان ان کے تھے۔ اس آسمان پر خدا معلوم کتنے ستارے چمکتے اور ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے، نام ونمود کی خواہش ونمائش، ایسے منظر دکھاتی ہی رہتی ہے لیکن علم، جب عشق ہوجائے تو ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ ع اے درد عشق اب نہیں لذت نمود میں

نواب صاحب مرحوم کی زندگی اسی دردِ عشق کی تفسیر بن گئی، بھیکم پور کا مدرسہ، ذاکر حسین اسکول، جامعہ اردو اور مسلم یونیورسٹی تو اس سرچشمۂ فیض سے قریب تر تھے۔ کتنے ادارے ایسے ہیں جو ان کے جود و کرم کی رداؤں میں مستور ہو کر مشکور ہیں۔ جنھوں نے ان کو قریب سے دیکھا وہ شاہد ہیں کہ غریبوں کی دستگیری، نادار طلبہ کی ہر ممکن مدد کو طبیعت ثانیہ بنانے والے ان جیسے نہیں دیکھے، غم گساری و غم خواری کے الفاظ کی معنویت کو نواب صاحب مرحوم نے جس طرح وقعت بخشی، آج کے دور میں اس کی اہمیت کا اندازہ کاش کیا جاسکے۔

اصل یہ ہے کہ یہ ساری صفتیں بلکہ نعمتیں غالباً اس دعائے پدری کی قبولیت کی علامت ہیں جس کی تلقین قرآن حکیم نے قرۃ اعین عطا کیے جانے کی درخواست میں کی ہے، وہ ایسے والد کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے جو ہر نیک تحریک کے مددگار، ہر اچھے کام کے معاون اور ہر شخص کی ہر ضرورت پر کام آنے والے تھے، آج سے ساٹھ سال پہلے شروانی مرحوم کے والد بزرگوار نواب سر مزمل اللہ خاں کا انتقال ہوا تھا تو معارف میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کو صوبہ کا حاتم کہتے ہوئے لکھا تھا کہ ''کوئی علمی و تعلیمی ادارہ ایسا نہیں جو ان کے سرچشمہ فیض سے سیراب نہیں، بلکہ جمعیۃ العلماء اور کانگریس تک ان کے خوان نعمت سے مستفید تھے...... جو آیا وہ اپنے نصیب کا حصہ پا گیا''، نواب مزمل اللہ خاں اکثر یہ شعر پڑھتے تھے کہ

نہ کس می دہاند نہ کس می دہد　　خدا می دہاند خدا می دہد

دین و دنیا کی ان نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والے سر مزمل اللہ خاں کو قرۃ اعین کی نعمت ملنی ہی تھی، حضرت سید ندویؒ کی تحریر کا عنوان اگر بدل کر حاتم یوپی نواب رحمت اللہ خاں کر دیا جائے تو بغیر کسی مبالغے کے کہا جاسکتا ہے کہ کم و بیش مضمون وہی کا وہی آج بھی ہے۔

سر مزمل اللہ خاں دارالمصنفین سے خاص محبت رکھتے تھے، خاص اس لیے کہ وہ علامہ شبلی کے دوستوں میں تھے، ندوہ اور دارالمصنفین سے یہ تعلق اسی نسبت سے تھے، حضرت سید ندویؒ نے لکھا کہ حیدرآباد اور بھوپال کی سرکاروں کے علاوہ اگر کسی محسن کے فیض سے مستفید ہوا تو وہ یہی بھیکم پور کے رئیس کی ذات تھی، رحمت اللہ شروانی مرحوم نے بھی اسی رشتہ کو برقرار رکھا، مولانا ضیاءالدین اصلاحی مرحوم سے تو ان کو بڑی محبت تھی، مولانا کی اچانک وفات سے ان کا دل بیٹھ گیا، ان کا تعزیت نامہ سب سے پہلے آیا، لکھا کہ ''یہ نقصان صرف میرا یا کسی فرد واحد کا نہیں بلکہ پوری ملت کا ہے جو بہ مشکل پورا ہو پائے گا''۔

وہ قریب چالیس پچاس رسائل کے خریدار تھے لیکن معارف کے لیے بے چین رہتے، ڈاکٹر

جمشید ندوی کے الفاظ میں وہ معارف کا حرف حرف پڑھتے، معارف میں انہوں نے محترم عابد رضا بیدار کے اشتراک سے شعر العجم کے متن کی تصحیح کے عنوان سے دو قسطوں میں بڑی دیدہ ریزی سے شعر العجم میں فارسی اشعار کے اغلاط کی تصحیح کی، یہ محنت انہوں نے اس جذبے سے کی کہ تنہا شعر العجم وہ کتاب ہے جو بیسویں صدی اور اب اکیسویں صدی کے ہندوستان میں فارسی ادب کو زندگی بخشتی رہی ہے اور جس نے چار نسلوں کے ذہن و ذوق کی آب یاری کی ہے۔ اس مضمون پر حاشیہ دیتے ہوئے مولانا اصلاحی مرحوم نے لکھا کہ "محترم رحمت اللہ شروانی صاحب پشتینی دار المصنفین کے محسن اور اپنی فارسی دانی اور شعر فہمی کے لیے ہندوستان میں اپنی آپ مثال ہیں"، فارسی سخن دانی و سخن شناسی کی یہ بے مثال صلاحیت بھی پشتینی ہی تھی، نواب مزمل اللہ خاں تو فارسی کے شاعر اور صاحب دیوان شاعر تھے، ان کی ایک دو غزلیں معارف میں چھپی بھی تھیں، رحمت اللہ شروانی مرحوم واقعی سر لابیہ کے مصداق تھے، فارسی اشعار کے وہ گویا حافظ تھے، فارسی کے ایسے اشعار جو ضرب المثل کی شکل میں ہیں اور کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا شاعر کون ہے، ایسے قریب ۱۷۱ اشعار کو حوالوں کے ساتھ انہوں نے جمع کیا اور آوارہ گرد اشعار کے نام سے شائع کر دیا۔

مال و زر اور علم و ادب دونوں کی ریاست نے بہتوں کو انما اوتیتہ علی علم عندی کے بھرم میں ڈال دیا لیکن شروانی مرحوم ہمیشہ والآخرۃ خیر وابقی کی حقیقت کے قائل و معترف رہے، ان کے والد بزرگوار، زندگی کے اختتام اور کسی نیک عمل کے قبول کی حسرت ظاہر کرتے تھے، حضرت سید ندوی نے ایسے ہی ایک موقع پر تسلی دی کہ حاتم کی بیٹی دربار رسالت میں اپنے باپ کی فیاضی کی بدولت عزت کی مستحق ٹھہریں، پھر کوئی سبب نہیں کہ آپ کی تمام عمر کی فیاضی کے کام دربار الٰہی میں قبولیت کے مستحق نہ ٹھہریں، ہم بھی ان الفاظ کو یقین سے دہرا سکتے ہیں۔

شروانی مرحوم کے لیے حضرت سید ندویؒ نے دعا کی تھی کہ اس خورد سال جانشین کو عمر و اقبال اور توفیق خیر سے بہرہ مند فرمائے، اس دعا کو شرف قبولیت حاصل ہوا، معارف شروانی صاحب مرحوم کے صاحبزادے جناب مدحت اللہ خاں شروانی کے لیے اسی دعا کی تجدید کرتا ہے اور شروانی صاحب مرحوم کے لیے دعاہائے مغفرت کا نذرانہ پیش کرتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ

ع تھی تری موج نفس بادِ نشاط افزائے علم

ع۔ص

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

جہان غالب : مدیر ڈاکٹر عقیل احمد، صفحات ۱۱۲، کاغذ وطباعت بہتر، قیمت: فی شمارہ ۲۰ روپے، سالانہ ۸۰ روپے، ڈاک سے ۵۰ روپے، پتہ غالب اکیڈمی ۱/۱۶۸، بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی-۱۳۔

۲۰۱۰ میں غالب اکیڈمی نے میر تقی میر کی وفات کی دوسری صدی کے موقع پر ایک ادبی مذاکرہ کا اہتمام کیا۔ موضوع ''میر کی شعری روایت میر تا غالب'' تھا، ملک کی مشہور و مقتدر ادبی ہستیوں نے اس میں شرکت کی، زیرنظر شمارہ ان کے مقالات پر مشتمل ہے، شمس الرحمٰن فاروقی نے اس سمینار میں کلیدی خطبہ پیش کیا جو خاص طور پر میر کی شعری روایات کے مطالعہ کے لیے خاص تھا، یہ خطبہ اس رسالہ کا پہلا مضمون ہے، جناب فاروقی کے مطابق میر کا سرچشمہ فیضان ولی ہیں اور اسی فیضان کا اثر میر کے توسط سے ناسخ وغالب تک پہنچا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شعریات سب کی ایک ہی ہے۔ ولی نہ ہوتے تو میر کا وجود مشکل تھا۔ غالب کی انقلاب آفرینی میں ناسخ اور آتش کے عناصر بھی کارفرما ہیں۔ ان کے خیال میں ولی اور میر میں وہی رشتہ وتعلق ہے جو ناسخ اور غالب میں ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین کے مقالہ کا عنوان ہے ''کیا میر یہی ہے جو ترے در پہ کھڑا تھا''، میر کی شناخت میں ان کا کہنا ہے کہ کلاسیکی غزل میں عاشق کی صفات و امتیازات کا بہت مکمل اور مثالی تصور ہے جسے میر نے اپنے کلام میں اس کے نصاب کے اہتمام کے ساتھ پوری فنکاری سے نظم کیا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے عاشق کی مستی، بے خودی، بے نیازی اور کسی حد تک استغناء کی صفات کو روایتی عاشق کی صفات میں اس طرح شامل کیا ہے کہ ان کے عاشق کا انفرادی کردار بہت نمایاں ہوگیا ہے۔ روایت میں ان کے تخلیقی ترجیحات کی یہی شمولیت میر کے عاشق کا شناختی نشان اور بحیثیت شاعر میر کا قابل قدر امتیاز ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے ''درد کے کلام میں

مجاز کی حقیقت'' کے عنوان سے لکھا کہ میر درد کے اردو اور فارسی کلام میں اچھے خاصے ایسے اشعار ہیں جن میں سیر وسلوک کے مسائل اور صوفیانہ فکر کی گونج بہت واضح ہے۔ ان کے اشعار کو جذبات کی تہذیب، لہجہ کی شائستگی اور آواز کی نرمی ہوا و ہوس کی آلودگی سے محفوظ رکھتی ہے۔ جسمانی علائق کی گراں باری کے باوجود پاکیزگی کی یہی فضا ان کے اشعار میں روحانی ترفع کا احساس دلاتی ہے۔ دوسرے مقالات کے بعض عنوانات اس طرح ہیں مومن خاں دور انتشار کا ایک دلکش فنکار، ظفر کی کیمیائے شاعری، غزل گو ناسخ، آتش کی غزل، میر و غالب کی روایت کی ایک اہم کڑی، سبحان علی خاں، غالب-گلزار شاعری کا گل ہزارہ اور کچھ غالب کے بارے میں وغیرہ۔ یہ مقالات ڈاکٹر سید عبدالباری، ڈاکٹر اسلم پرویز، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر ارجمنڈ آرا، پروفیسر حنیف نقوی، ڈاکٹر مسعود جعفری اور ڈاکٹر عقیل احمد مدیر رسالہ جیسے معروف اہل قلم کے قلم سے ہیں اور موضوعات پر سیر حاصل بحث پیش کرتے ہیں۔ آخر میں مرزا غالب سے متعلق بعض نئی کتابوں پر تبصرے ہیں اور غالب اکیڈمی کی علمی سرگرمیوں کی روداد بھی ہے۔ رسالہ کتابت کی تصحیح اور توجہ کا طالب ہے۔

جوش بانی ۵-۶، (ترقی پسند نمبر): مرتبین اقبال حیدر اور علی احمد فاطمی، صفحات ۵۲۷، کاغذ و طباعت بہتر، قیمت: ۳۰۰ روپے (ہندوستان)، ۵۰۰ روپے (پاکستان)، پتہ ۶۸، مرزا غالب روڈ، الہ آباد، انڈیا۔

رسالہ جوش بانی کے اس خصوصی شمارے میں قریب ستر نظمیں اور ان کے تجزیے شامل ہیں، موضوع کے تعلق سے شروع میں آٹھ مضامین مزاحمتی ادب، ترقی پسند نظم، آزادی کے بعد ترقی پسند نظم، ترقی پسند فکر اور ترقی پسند شاعری، ادب و انقلاب، نظریاتی کردار کی توسیع اور ترقی پسند نظم کی شعریات وغیرہ کے عنوانات سے ہیں اور یہ محمد حسن، سید عقیل، صدیق الرحمٰن قدوائی، شارب ردولوی اور عتیق اللہ، اقبال حیدر، ابن کنول اور علی احمد فاطمی جیسے معروف نقادوں کے تنقیدی و نظریاتی مطالعات و افکار کے عکاس ہیں۔ عتیق اللہ اور اقبال حیدر نے ترقی پسند فکر اور ادب کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا ہے، جن سے فکری تازگی نمایاں ہے۔

تجزیاتی مطالعات کے حصے میں قدیم و جدید دونوں زاویے یکجا کیے گئے ہیں یعنی جہاں میرا جی اور قاضی افضال حسین کی کتابوں سے اکتساب و اقتباس ہے وہیں سید محمد عقیل، محمود الحسن

رضوی، فضل امام، اقبال مجید اور عابد سہیل کی تحریریں نئے پن کا احساس دلاتی ہیں۔

آج جبکہ ترقی پسند تحریک اور اس کے ادب کا غلغلہ اب ویسا نہیں جیسا پہلے کبھی تھا، تاہم اس کا وجود آج بھی ہے، عنوان ضرور بدلے ہیں لیکن عورت، دیہات، دلت، فرقہ واریت و صارفیت وغیرہ مسائل و مضامین اضطراب، مزاحمت، کرب ذات اور احتجاج کے ان عوامل سے خالی نہیں جن کی بنیاد پر ترقی پسند تحریک کی عمارت قائم ہوئی تھی۔ ندا فاضلی، شاہد ماہلی، عبدالاحد ساز اور شہناز نبی وغیرہ کی نظموں کی شمولیت اسی احساس کا پیام نو ہے کہ ترقی پسند ادب کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ ادبی تحریکات سے نظریات پر مبنی اختلاف رائے سے مفر نہیں، لیکن اس قسم کی ادبی کاوشیں بہرحال علمی و ادبی نافعیت و افادیت سے تہی بھی نہیں اور اسی لیے ہم جوش بانی کے اس ترقی پسند نمبر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

سہ ماہی جہان اردو: مدیر ڈاکٹر مشتاق احمد، صفحات ۳۶۸، کاغذ و طباعت بہتر، قیمت: فی شمارہ ۵۰ روپے، سالانہ ۲۰۰ روپے، قیمت (اس شمارہ کی) ۱۰۰ روپے، پتہ دفتر جہان اردو، محلّہ رحیم گنج پوسٹ لال باغ، دربھنگہ، ۸۴۶۰۰۴، بہار۔

سرزمین بہار سے شائع ہونے والے متعدد ادبی رسالوں میں جہان اردو کو وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ رسالہ بہار میں اردو ادب کی رفتار و ترقی کا خوبصورت منظرنامہ ہے۔ موجودہ اردو ادب پر نظر رکھنے والوں میں ایک احساس یہ بھی ہے کہ بعض ادبی رویوں کی شورانگیزی سے کلاسیکی ادب کی آوازیں پست یا گم ہوتی جاتی ہیں، جہان اردو نے اسی احساس کے تحت اشارہ کیا ہے کہ ہم کلاسیکی ادب کو نظرانداز کر کے شناخت قائم نہیں رکھ سکتے۔

زیرنظر رسالہ تیس سے زائد مضامین کا مجموعہ ہے جو تحقیق و تنقید، افسانہ و ناول نگاری، شخصیات اور شعر و سخن کے زیرعنوان منقسم ہے، اقبالیات، سامراجیت، نوعمر دانشوروں کا رجحان، نطشے کا فلسفہ جیسے مضامین کے علاوہ کلیم عاجز، نذیر بنارسی پر بھی مضامین ہیں، جموں کشمیر میں اردو سفرنامے، جدید عصری تقاضے اور اردو کا مستقبل، خاکہ نگاری جیسی تحریروں نے اس کو تنوع کی خوبی بھی دی ہے اور پروفیسر لطف الرحمٰن، پروفیسر ممتاز احمد خاں، پروفیسر بشیر احمد نحوی، ڈاکٹر شیخ عقیل، ڈاکٹر عبدالسلیم، ڈاکٹر ریاض احمد، ڈاکٹر انور ایرج، خالد رسول گنائی، مشرف عالم ذوقی،

قاسم خورشید، سید احمد قادری، دیپک کنول اور نثار احمد صدیقی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، پروفیسر غضنفر اور ڈاکٹر مسیح الزماں وغیرہ جیسے اہل قلم کی شمولیت نے اس شمارے کی وقعت میں یقیناً اضافہ کیا ہے۔انیسویں صدی کے آخر میں لکھی گئی مثنوی ''درشاہوار'' (شاہزادہ زبیرالدین گورگانی) کی پیش کش سے بھی افادیت بڑھ گئی ہے۔

مجلّہ دراسات دینیہ : مرتبین پروفیسر علی محمد نقوی و ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، صفحات ۴۰۰، کاغذ و طباعت عمدہ، قیمت درج نہیں، پتہ فیکلٹی آف تھیالوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲، یوپی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مقصد عصری علوم کے ساتھ دینی علوم پر بھی دسترس حاصل کرنا اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اعلی معیار پر ان کو پیش کرنا تھا۔شعبہ دینیات کی اہمیت اسی لیے تھی اور یہ آج بھی قائم ہے، اس کی فیکلٹی کو قدیم ترین فیکلٹی کا ہی اعزاز حاصل نہیں بلکہ اس کے سنی و شیعہ شعبہ جات نے اب تک افراد و اعمال دونوں طرح قابل تحسین کارنامے انجام دیے ہیں۔

زیرنظر مجلّہ اسی فیکلٹی کے اساتذہ اور طالب علموں کے علمی و تحقیقی کاوشوں کا ترجمان اور وہاں کی علمی سرگرمیوں کی روداد بن کر سامنے آیا ہے اس میں بیس سے زائد اہم مضامین و مقالات قرآن و حدیث، تفسیر، ملی و قومی مسائل، سیرت و سوانح، شخصیات، دینی و مذہبی رواداری، اسلامی عہد کی شان و شوکت اور بعض اہم کتب کے علمی و تحقیقی تجزیہ و تبصرہ جیسے موضوعات پر شامل ہیں۔

شعبہ دینیات کے علاوہ یونیورسٹی کے دیگر شعبوں کے اہل قلم اور دانشوروں کی نگارشات، اصل سے تعلق اور یونیورسٹی کے مخلص بانی سرسید احمد خاں کے جذبہ وفکر سے ہم آہنگی کی شاہد ہیں، حسن انتخاب و ترتیب میں وہی دلکشی ہے جو خود یونیورسٹی کی دنیا کو دوسری دنیاؤں سے ممتاز کرتی ہے، شعبہ دینیات اور اس مجلّہ کے مرتبین بجا طور پر تحسین و آفریں کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دینے کی کوشش کی ہے۔

ت، ا، ندوی

ادبیات

مرحبا سید مکی مدنی العربی

(تضمین بر غزل قدسی)

سید حنیف احمد نقوی

در پہ صف بستہ ملائک پے عزت طلبی　　سر جھکائے ہوئے افلاک بہ صد با ادبی
تر زباں مدحتِ سرکار میں یوں سارے نبی　　مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت ، چہ عجب خوش لقبی

دیکھ کر شمعِ نبوت کی مبارز طلبی　　مطلعِ دہر سے کافور ہوئی تیرہ شبی
ابر رحمت کا اٹھا ، گرد ضلالت کی دبی　　مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جاں باد فدایت ، چہ عجب خوش لقبی

دیدہ و دل میں ہے مدت سے رقابت باہم　　شوقِ دیدار کسی طرح نہیں ہوتا کم
اک قیامت ہے کہ ہے قامت و قد کا عالم　　منِ بیدل بہ جمالِ تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمال است بدیں بو العجبی

خستہ و خوار و زبوں ، زار و نزار و مضطر　　چاک پیراہن و آشفتہ دل و خاک بہ سر
سارے در چھوڑ کے آیا ہوں درِ اقدس پر　　چشمِ رحمت بکشا ، سوے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ، ہاشمی و مطلبی

تیرے اخلاق کی خوشبو سے مہکتے ہیں مشام　　تیری برکات ہیں وافر ، ترا فیضان ہے عام
استقامت کی ضمانت ہے جہاں میں ترا نام　　نخلِ بستانِ مدینہ زتو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرۂ آفاق بہ شیریں رطبی

خاکِ عرش نشیں ، شاہ سوارِ اسرا　　منفرد شان تری ، ذات بھی تیری یکتا
تیرا ہمسر نہ ہوا کوئی ، نہ کوئی ہوگا　　نسبتے نیست بہ ذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم توچہ عالی نسبی

اے کہ از عذبِ لبت شہد نمودی سم را　　اے کہ از لطف ربودی تو زجاں ہا غم را

سابق پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی۔

اے کہ بنو اختی از جود ہمہ عالم را نسبتے نیست بہ ذاتِ تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم توچہ عالی نسبی

اے کہ اعمال ترے رحمتِ حق کی آیات اے کہ اخلاق کی قدروں کو ملا تجھ سے ثبات
اے کہ سرچشمۂ الطاف وعطا ہے تری ذات ماہمہ تشنہ لبانیم ، توئی آبِ حیات
رحم فرما کہ ز حد می گزرد تشنہ لبی

کھول دے اپنے غلاموں کے لیے بابِ حیات بخش دے سوختہ جانوں کو تب وتابِ حیات
لینے آئے ہیں ترے در پہ مےِ نابِ حیات ماہمہ تشنہ لبانیم ، توئی آبِ حیات
رحم فرما کہ ز حد می گزرد تشنہ لبی

کسی صورت، کسی پہلو، کسی ساعت، کسی دم اضطرابِ دلِ بیتاب نہیں ہوتا کم
تیرے دربار میں لائی ہے اب امیدِ کرم نسبتِ خود بہ سگت کردم و بس منفعلم
زاں کہ نسبت بہ سگِ کوے تو شد بے ادبی

اے رسولوں میں مخاطب بہ خطاب لولاک تیرے قدموں سے لپٹ کر یہ زمیں ہوگئی پاک
تیری رفعت کے تصور سے ہے قاصر ادراک شبِ معراج عروجِ تو گذشت از افلاک
بہ مقامے کہ رسیدی ، نرسد ہیچ نبی

تودۂ ریگ کی تمثال تھے تیرے لیے دشت تھی زمیں ایک پیالہ تو سمندر اک تشت
ایک جلوہ تھا فقط سبع سماوات کا گشت شبِ معراج عروجِ تو از افلاک گذشت
بہ مقامے کہ رسیدی ، نرسد ہیچ نبی

بس کہ ہر فرد کی تھی حق کو ہدایت منظور سارے عالم کو کیا نور سے تیرے معمور
تھا مگر مصلحتِ وقت کا کچھ پاس ضرور ذاتِ پاک تو کہ در ملکِ عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبانِ عربی

حاصلِ رنجِ شب و روز و مہ و سال مپرس داشت دربند چساں حبِ زر و مال ، مپرس
چہرہ ہاے عرق آلود نگر ، حال مپرس عاصیانیم ، ز ما نیکیِ اعمال مپرس
سوے ما روے شفاعت بکن از بے سببی

یہ حوادث کا ہجوم اور یہ امت تیری موج در موج ہیں طوفان ، شکستہ کشتی
غیر ہے شدتِ صدمات سے حالت دل کی سیدی انت حبیبی و طبیبِ قلبی
آمدہ سوئے تو قدسی پےِ درماں طلبی

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

کتابِ دہر کے اوراق پر کیا کیا نہیں دیکھا کوئی بھی نقش ہستی ایسا تابندہ نہیں دیکھا

نہیں دیکھی کہیں آنکھوں نے اتنی دلربا سیرت نہیں دیکھا سراپا ایسا پاکیزہ نہیں دیکھا

عزیزوں سے تو اپنے سب کو ہی ہوتی ہے ہمدردی کوئی اس طرح دشمن کو دعا دیتا نہیں دیکھا

ابو جہل و ابو طالب بھی شاید کلمہ پڑھ لیتے مگر دل کی نظر سے آپؐ کا چہرہ نہیں دیکھا

شبِ اِسرا نبیؐ نے جیسے دیکھا اپنی آنکھوں سے کسی نے آج تک یوں عالمِ بالا نہیں دیکھا

نہ دیکھا زندگی میں کعبہ اور سرکارؐ کا روضہ تو ،تو نے کچھ بھی پھر اے دیدۂ بینا نہیں دیکھا

رئیس افسوس اس انساں نما حیوان پر ، جس نے
ابھی تک ، آزما کر آپؐ کا اسوہ نہیں دیکھا

تاریخ وفات عرفان عباسی

بزرگ ترین تذکرہ نویس ہند در عصر حاضر

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

آن شناسندۂ بزرگ سخن آن نویسندۂ بلند آوا

آنکہ با ہمت خداداش کرد تالیفِ خیلی تذکرہ ہا

نسبًا آنکہ بود عباسی نام عرفان بودہ است او را

تا نود سال زیست ، سر انجام کرد قالب تھی بہ امر خدا

رخت بر بست ازین سرای سپنج بہ سوی آخرینِ منزلہا

سالِ فوتش بہ ارتحال ، رئیس
گفت : ’’ ہای مورخِ شعرا ‘‘
۱۴۳۳ھ

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ، ۲۰۰۱-۱۰۔

مطبوعات جدیدہ

ترجمان القرآن الکریم: مرتب جناب احمد ابوسعید، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۹۴، ہدیہ ۳۹۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی ہند، دہلی وحیدر آباد اور دہلی، دیو بند، حیدر آباد اور مئو کے مکتبے۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ کی تفہیم القرآن محتاج تعارف نہیں، مولانا کی حیات ہی میں اس تفسیر کو شہرت اور قبولیت ملی، آخر میں مولانا مرحوم نے اسی تفہیم القرآن کے تفسیری حواشی کو مختصر کر کے ایک ہی جلد میں ''ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی'' کے نام سے شائع فرمایا، تاہم ان کے ایک نہایت مخلص عقیدت مند اور زیر نظر نسخہ کے مرتب کو خیال ہوا کہ اس مختصر ترجمہ قرآن میں مولانا مودودی کی ترجمانی جو آیت بہ آیت واضح نہیں ہے اس کو ان ہی کے الفاظ میں مرتب کیا جائے تا کہ خود مولانا کی اس ہدایت پر بہ آسانی عمل ہو سکے کہ ایک ایک آیت کے بالمقابل ترجمہ پڑھا جائے، یعنی مسلسل ترجمے کو اس طرح جملوں میں تقسیم کیا جائے کہ پڑھنے والے کو آیت کے بالمقابل الفاظ کے ترجمہ کا علم ہو سکے، مرتب نے یہ کام بڑے سلیقے اور بڑی محنت سے مکمل کیا ساتھ ہی لغات القرآن کے عنوان سے ہر صفحہ پر نئے الفاظ کے معانی کی ایک فہرست بھی دیتے چلے گئے، قرآن کریم کے عربی متن کے لیے انہوں نے المصحف الشریف مصدقہ حرمین شریفین کا انتخاب کیا، اصل ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی میں موضوعات و مضامین کی فہرست نہیں تھی، فاضل مرتب نے یہ فہرست بھی مرتب کر کے اس نسخہ کو اور بھی مفید بنا دیا، مرتب کو دراصل قرآن مجید سے وہ والہانہ شغف ہے جو ایک سچے مومن کی شان ہے، مولانا مودودی سے تعلق اور تفہیم القرآن سے محبت بھی اسی قرآنی نسبت سے ہے، انہوں نے جس طرح ترجمان القرآن الکریم کے سلسلے میں محنت کی اور بعض سخت مراحل طے کیے، اس کی کچھ جھلک ان کے ابتدائی تعارفی کلمات سے ہوتی ہے، یہ یقیناً ان کے درجات کی بلندی کے اسباب میں عنداللہ شمار ہوں گے، بارہ سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل اس صحیفہ کی ہر منزل انہوں نے اپنے شوق سے طے کی، اس کے لیے وہ قابل رشک ہیں، ان کی اس دعا پر ہر زبان آمین کہے گی کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید سے قربت و محبت اور ہدایت و رہنمائی کی توفیق و سعادت عطا فرمائے۔

مرقع سیرت طیبہ: مرتب جناب سید نصیر الدین احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۲۲۴، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: مولانا آزاد ایجوکیشنل سوسائٹی 4-5-5، پالمور، محبوب نگر اے پی اور خود مولف کا پتہ ۲۰۷۔ سومیا اپارٹمنٹس، ریڈ ہلز، حیدر آباد اے پی۔

حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ کی تالیف سے ہزاروں کیا بے شمار اہل قلم نے اپنے قلم کو پاکیزہ بنایا ہے، زیر نظر کتاب اسی مبارک عمل کے تسلسل کا ایک حصہ ہے، لائق مولف کو تاریخ اسلام سے خاص شغف ہے، ان کی ایک کتاب ''تاریخ اسلام سنین کے آئینہ میں'' شائع بھی ہوچکی ہے، قرآن مجید کے مطالعہ سے انہوں نے محسوس کیا کہ نبوت محمدیؐ کوئی مجرد واقعہ نہیں بلکہ نبوت ورسالت کے نظام الٰہی کے تاریخی سلسلے کی ایک کڑی ہے، اسی تاریخی ذوق کی تکمیل کہنا چاہیے یہ کتاب ہے جس میں جذبات عقیدت کے ساتھ مورخانہ بصیرت کی کارفرمائی نمایاں ہے، کتاب کو تین حصوں یعنی قرآن مجید، سیرت پاک اور حدیث شریف میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا حصہ مختصر ہے لیکن قرآن مجید کے متعلق چند بنیادی باتوں کو پیش کرنے میں کامیاب ہے، دوسرے حصہ میں سیرت کے عنوان سے کئی نعتیں، مقامات نبویؐ کے نقشے، شجرے، ازواج مطہراتؓ، اولاد، اعزہ واقربا، شمائل، وغیرہ کا ذکر سادہ و سلیس انداز میں ہے کوشش کی گئی ہے کہ بنیادی معلومات ضرور آجائیں، اسی طرح اسفار وسرایا وغزوات کا ذکر ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اکثر مہمات کے نقشے بھی دے دیے گئے ہیں، تیسرا باب بہت مختصر ہے، حدیث جبرئیلؑ اور حدیث وفد الازد کو ترجمان السنہ سے نقل کردیا گیا ہے، سنین کے آئینہ میں حیات طیبہؐ کے عنوان سے گویا اشاریہ ہے اور اشاریہ کی افادیت ظاہر ہے۔ زبان وبیان دونوں لحاظ سے یہ ہر شخص کے لیے اور خصوصاً طالب علموں کے لیے مفید کتاب ہے۔

زمین عرب گل کھلاتی ہے کیا کیا: از جناب اخلاق احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۲۷۸، قیمت ۲۵۰ روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز N-1 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی اور علی گڑھ کے مشہور مکتبے۔

علی گڑھ کی سرزمین پر رہ کر ارض حجاز کی فضاؤں میں سانس لینے کی تمنا کوئی تعجب خیز بات نہیں لیکن امریکا کی خوش گوار اور باذوق مصنف کی زبان میں خوش ذائقہ یادوں کی تہہ سے اگر ارض حجاز کا شوق سر اٹھانے لگے اور اس کا جلوۂ بیتاب نور کا فوارہ بن جائے تو یہ حیرت آگیں مسرت یا مسرت آگیں

حیرت کا سبب ضرور ہوسکتا ہے ہاں ذوق اگر پاکیزہ ہو اور شوق بے پایاں ہو اور دل جذب کی کیفیت سے سرشار ہو تو غیاب میں بھی حضوریؐ کی لذت مل ہی جاتی ہے، صاحب کتاب کے لیے امریکہ میں رہ کر بقعہ مبارکہ کی کشش اس جذبہ ایماں کو فروزاں کرتی رہی جس سے دل وجاں روشن تر ہوتے رہتے ہیں اور عہد گذشتہ کی یادوں کو محض اس لیے تازہ کرتے رہتے ہیں کہ اندھیرے، چراغوں کی تلاش میں ہیں، آخر جذب دل کام آہی گیا، بلاوا آگیا جس کو لبیک کہنے کی سعادت ہی زندگی کا حاصل ہے، مصنف انشاء پرداز ہیں اور تاریخ کی گردشوں اور کروٹوں کے راز داں بھی ہیں، ارض مبارک کی زیارت کی سعادت ملی تو انشاء پردازی اور تاریخی شعور کو ہم آمیز ہونے کی فرصت بھی میسر ہوئی، خامہ بسم اللہ کہہ کر چلا، مقصد تھا عرب کی صحرانوردی کا بیان، مگر یہ کس شان سے! اس کا اندازہ اولین عنوان سے لگایا جاسکتا ہے، بات عرب کے جغرافیہ کی ہے اور عنوان ہے ''عرب بربط فطرت''، جغرافیائی انشاء پردازی کی یہ جھلک کہیں اور کم ہی نظر آئے گی، سعودی عرب کی سیاسی تقسیم، باشندے، آب وہوا اور مٹی، پیڑ پودے، جانور، معیشت کے ساتھ چند سیاحوں کے بیان اور پھر اسلام سے پہلے کے عرب کا تعارف، علم وتحقیق کی روشنی میں یہ تمہید اس لیے کہ حرف مطلب زبان پر یقین کے ساتھ آجائے، تشبیب کے بعد گریز کا یہ انداز ملاحظہ ہو''قرآن تاریخ کے اجالے میں نمودار ہوا اس لیے ہر چیز کی سراغ رسانی ممکن ہے.....قرآن کی روشنی میں زندگی صرف زندگی ہی نہیں، بندگی بھی ہے.....ترقی وتبدیلی کی سطح کتنی ہی بلند ہوجائے قرآنی نیلوفر ہمیشہ اوپری سطح پر نظر آئے گا'' قرآن کا ذکر ہوا تو منطقی ترتیب تھی کہ صاحب قرآن کا مبارک بیان ہو، سرخی نے ہی اصل مضمون کی وضاحت کردی، چمن دہر میں پیغمبری، آگے یہ اعتراف کہ ''سیرت پر لکھنے سے پہلے تصور میں بہت سی ریشمی گرہیں لگنا شروع ہوجاتی ہیں'' سیرت کا بغور مطالعہ کیا جائے تو مصوری یا مجسمہ سازی کی ضرورت ہی نہیں رہتی، دل کی دھڑکنیں جب صریرِ خانہ بنتی ہیں تو سرگوشیاں کھل کر کہنے لگتی ہیں کہ'' آپؐ چلتے پھرتے عمل صالح کی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں، دیدۂ تر میں لہراتے ہوئے ......اتنے قریب جیسے جسم کے اندر سانس اندر باہر آتی جاتی ہے''، عرب کا کوئی جغرافیہ کوئی تاریخ، سیرت کے مطالعہ کے بغیر مکمل نہیں، یہ کتاب اس کی بہترین مثال ہے، تعارف سے بات نہیں بنتی، اصل کتاب کا مطالعہ ضروری ہے تب اس ترمیم شدہ مصرع کی معنویت آشکارا ہوتی ہے کہ زمین عرب گل کھلاتی ہے کیا کیا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، دعوت وفکر کے اہم پہلو: از مولانا بلال عبدالحئی حسنی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۳۸۴، قیمت ۱۴۰ روپے، پتہ: ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم، میدان پور، تکیہ کلاں، رائے بریلی یوپی اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء ومکتبہ اسلام گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ۔

مسلمانوں میں ماضی قریب کی نمایاں شخصیتوں کا جب بھی شمار کیا جائے گا اوران کی اگر مختصر ترین فہرست بھی مرتب کی جائے گی تو اس میں حضرت مولانا علی میاںؒ کا نام اس لیے شامل ہوگا کہ ان کی جامع اور متوازن فکر نے عالم اسلام پر اثر ڈالا اور غیر اسلامی دنیا میں بھی ان کے طرز عمل نے مثبت ردعمل کی کامیابی حاصل کی، مولانا نے خود احتسابی کے ساتھ دعوت اور پیغام حق کی پریقین ترسیل کے لیے خود کو ایک نمونہ کی شکل میں پیش کیا، مولانا کی حیات میں اوران کی وفات کے بعد بھی ان کی زندگی کا مطالعہ کیا گیا، مورخ، محقق، مفکر، معلم اور مبلغ ان تمام اسمائے صفات کا مولانا کی ذات میں مشاہدہ کیا گیا اور دلائل کے ساتھ ان کو پیش بھی کیا گیا، ان کے کسی سوانح نگار، معتقد، منتقد یا محض قاری سے یہ حقائق پوشیدہ بھی نہیں رہ سکتے، مغربی تہذیب کا مقابلہ، حکام وامراء کی دینی وفکری رہنمائی، ادب اسلامی کی تشکیل، دینی تعلیم، پیام انسانیت، ملک اور بیرونی ملک کو درپیش دینی وملی مسائل اور عمومی طور پر اصلاح معاشرہ، یہی وہ ابواب ہیں جن سے مولانا کی کتاب زندگی مکمل ہوئی، زیر نظر کتاب میں ان ہی ابواب کے تحت مولانا کی تقریروں کا عطر اور رس اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ ذوق نظر شاد کام اور مشام فکر گل بداماں ہوتی جاتی ہے، یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ کارنامے جو ایک مدت پر محیط تھے ان کو یکجا کرنا اور سلیقہ سے پیش کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ موجودہ ماحول میں اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر ان کے لیے بے حد مفید ہے جن کا مقصد ہر اس انسان کی خیر خواہی ہے جو اپنے مقصد تخلیق سے آشنا ہونا چاہتا ہے۔

رحمت عالمؐ (THE MERCIFUL PROPHET): مترجم جناب نجم الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر سالم سلطان، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۱۵۲، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: نظامی بک ایجنسی، بدایوں یوپی اور مولف کا پتہ: B-87، نہرو وہار، کلیان پور، لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب ''رحمت عالمؐ'' کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل

ہے، بچوں کے لیے سیرت کا یہ تحفہ کچھ ایسا مقبول ہوا کہ اب اس کے ایڈیشنوں کا شمار بھی مشکل ہے، ہندی اور مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور اب زیرنظر ترجمہ انگریزی زبان کا ہے، سید صاحب نے اس کتاب کے لیے سلاست وسادگی وروانی پر خاص توجہ کی تھی، مترجم حضرات نے انگریزی میں مضامین کو منتقل کرتے ہوئے اس خوبی کو بھی پیش نظر رکھا اور عام فہم انگریزی میں بڑی کامیابی سے یہ فریضہ انجام دیا، فاضل مترجمین کی یہ احتیاط قابل داد ہے کہ بجز ٹائٹل کے انہوں نے کہیں اپنا اظہار نہیں کیا، دیباچے وہی ہیں جو سید صاحب نے سپرد قلم کیے تھے، حضرت سید صاحب کا ایک جامع تعارف آخری صفحہ پر ہے، مترجمین حضرات کے تعارف کی خواہ وہ مختصر ہی ہوتا، ضرورت تھی تاہم اس سے بھی احتراز کیا گیا، خودنمائی کے اس دور میں اخفائے ذات کا یہ عمل واقعی لائق تحسین ہے، توقع ہے کہ جس طرح رحمت عالمؐ کو عالم میں قبول حاصل ہوا، یہ ترجمہ بھی اسی طرح مقبول اور نافع ہو۔

جوئے رواں: از جناب طاہر حمید تنولی، قدرے بڑی تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات ۴۶۴، قیمت ۴۵۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۱۶، میکلوڈ روڈ، لاہور۔

کلیات اقبال اردو یعنی مجموعہ بانگ درا، بال جبرئیل، ضرب کلیم اور ارمغان حجاز کے تمام اشعار کا یہ اشاریہ، اقبالیات کی دنیا کا ایک اور حیرت انگیز کارنامہ ہے، کلام اقبال کے فارسی اور اردو کلیات کے بعض اشاریے پہلے بھی شائع ہوچکے ہیں، لیکن وہ سقم اور نقص سے خالی نہیں تھے، اغلاط سے بھی بالکل پاک نہ تھے، اسی تلافی کی غرض سے یہ اشاریہ مزید اس سہولت کے پیش نظر مرتب کیا گیا کہ کلیات کے جو نسخے متداول ہیں اور مستند بھی جیسے غلام علی اینڈ سنز اور اقبال اکادمی کی اشاعتیں، ان ہی کا حوالہ ہو، اشاریہ حروف تہجی کے اعتبار سے ہے، کلام اقبال کے بے شمار اشعار یا مصرعے زبان زد بلکہ ضرب المثل ہوچکے ہیں، وہ کس مجموعہ میں ہیں یا مکمل شعر کیا ہے؟ اس کے لیے یہ اشاریہ، شاہ کلید ہے، جناب سہیل عمر کے اس تاثر میں ہم برابر کے شریک ہیں کہ ''اب کم از کم کلیات اقبال اردو کا پورا متن اقبالیات کے طلبہ اور ماہرین کے لیے بہت تفصیل کے ساتھ مورد استفادہ بن جائے گا''، ایسی وقیع اور مفید کاوش کے لیے اقبال اکادمی اور اشاریہ نگار ہمیشہ کی طرح داد وتحسین کے لائق ہیں۔

ع۔ص

رسید مطبوعہ کتب

۱- **غلبۂ اسلام اور دوسری تحریریں**، راشد شاز، انسٹی ٹیوٹ آف مسلم امہ افیرز، 4/1176-D، نیو سر سید نگر، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲، قیمت درج نہیں۔

۲- **جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کی تدریس کے مسائل**، پروفیسر عبدالستار دلوی، دی دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، کے، بی ہدایت اللہ روڈ کیمپ پونے، قیمت ۱۵۰ روپے۔

۳- **قبولیت عمل کے شرائط**، مولانا محمد منیر عالم، مکتبہ سلفیہ بی ۱۸/۱ جی، جامعہ سلفیہ مارگ، ریوڑی تالاب بنارس، قیمت درج نہیں۔

۴- **علامہ محمد شہاب الدین ندوی۔نقوش وتاثرات**، حافظ جمیل الرحمٰن ندوی، فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، 82 1st 10th کراس BTM اسٹیج بنگلور، قیمت درج نہیں۔

۵- **مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات**، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلیکیشنز ڈومن پورہ (کساری) مئوناتھ بھنجن (یوپی)، قیمت ۱۰۰ روپے۔

۶- **مولانا محمد سورتی حالات زندگی اور علمی خدمات**، ضیاء اللہ کھوکھر، ۱۱۳ اسلام آباد (گوجرانوالہ)، قیمت درج نہیں۔

۷- **حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا باہمی ربط**، ندوی بک ڈپو لکھنؤ، ندوۃ العلماء لکھنؤ، قیمت درج نہیں۔

۸- **عینی شاہد**، محمد طارق، محمد طارق کھولا پور، ضلع امراوتی، قیمت ۵۵ روپے۔

۹- **تحریک آزادی پاک وہند اور اہل حدیث**، محمد اشرف جاوید، مکتبہ دارارقم، فیصل آباد دارالفرقان، الفیصل مارکیٹ، اردو بازار لاہور، قیمت درج نہیں۔

۱۰- **جرأت رندانہ**، قاضی محمد عدیل عباسی، محمد ارشد عباسی، محلّہ آغا دریاخاں، گاندھی نگر بستی، قیمت ۱۲۵ روپے۔